



سالانہ چغہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/-

تصانیف نیاز فمچوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے والی
انجیل انسانیت

من ویزداں

سولانا نیاز فمچوری کی ۲۰ سالہ دو تصنیف تصانیف کا
ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام
نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ" و اخوتِ عالمہ کے ایک رشتہ
سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی
تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ
کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر سے
نہایت بلند اشار اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
ضمانت ۲۰۲ صفحہ ۱۰۰ جلد نور و پیہ لعلہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن سائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے
ان کی مختصر فہرست یہ ہے :- اصحاب کہف، معجزہ و کرامت
انسان مجبور ہے یا مختار، مذہب و عقل، طوفان نوح، خضر
کی حقیقت، مسیح علم تاریخ کی روشنی میں، یونس در وہان ہی
حسن یوسف کی داستان، قارون، ساحری، علم غیب، دعا
توبہ، یقمان، عالم برزخ، یاجوج ماجوج، باروت ماروت
حوض کوثر، امام مہدی، نور محمدی اور پل صراط، آتش نمرود وغیرہ
ضمانت ۶۲۲ صفحہ ۱۰۰ جلد نور و پیہ لعلہ علاوہ محصول

نگارستان جمالتان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات
اور انسانوں کا مجموعہ نگارستان نے
ملک میں جو رد قبول حاصل کیا اس
اندازہ اس سے کہہ سکتا ہے کہ ایک متعدد
مضامین غیر زبان تو نہیں منتقل کئے گئے
اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی
مقالات ایسے انعام کے لئے ہیں جو
پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے
ضمانت بھی زیادہ ہے
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیالیاں ترغیبات حبشی یا

اور دوسرے افسانے
حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ
جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا
بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور
ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر
واضح ہو گا کہ تاریخ کے ہموں اور تاریخی
میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں
حضرت نیاز کی انشائے اور
زیادہ دلکش بنا دیا ہے
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

شہوانیات حبشی یا
اس کتاب میں نفاشی کی تمام نظری
اور غیر نظری قسموں کے حالات
تاریخی و نفسانی حیثیت سے نہایت شرح
و ربط کے ساتھ حقائق تبصرہ کیا گیا ہے
کہ نفاشی دنیا میں کب کس طرح رائج
ہوئی اور نیزہ کہ کتاب عالم نے اس کے رائج میں
کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کے حیران کن
واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پُرانی ہندوستانی جہازوں کمپنی

بحر احمر اور مارشس

کی بندرگاہوں کو مسافروں اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ

بھئی سے

عدن ، جدہ ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی
اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ضرورت پڑنے
پر دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے

حسب ذیل پتہ پر لکھئے

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶۔ بینک اسٹریٹ بھئی

داخلی طور کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر
"نگار" آٹھ روپے چھ آنے میں دی جانی ہوگا

نگار

کی کہ آپ کا چنڈہ اکتوبر میں ختم ہو گیا اور نمبر کا
جس میں سالنامہ ۱۳۵۷ء کی قیمت بھی شامل ہے

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۲

فہرست مضامین اکتوبر ۱۳۵۷ء

شمار ۴

۴۲	آوارہ گرد اشعار	پروفیسر عطاء الرحمن کاکوی	۳	ادبیٹ	ملاحظات
۴۵	تاریخی اور ادبی لطیفے	محمد علی خاں اثر	۶	لطیف حسین ادیب ام	شیام موہن لال جگر بریلوی
۴۸	بابل استفسار (کوثر و تسنیم)	ادبیٹ	۱۲	ادبیٹ	گا ہے گا ہے باز خواں !
۵۱	منظومات	مسعود اختر جمال	۱۶	ادبیٹ	فارسی ادب کا تدریجی عروج و زوال
۵۳	فرنگ پارسی جدید	ادبیٹ	۲۵	محمد اسحاق صدیقی	مذہب عالم کی تخلیق اور قطب شمالی
			۳۳	ادبیٹ	نزاع کفر و اسلام

آئندہ سالنامہ داغ نمبر کی اہمیت کا اندازہ

اس کے بعض عنوانات اور اس میں حصہ لینے والے اکابر ادب کے ناموں سے کیجئے

چند عنوانات یہ ہیں :-

داغ کے حالات زندگی - داغ کا اثر اردو شاعری پر - داغ کا تفریل - داغ کی معاملہ بندی - داغ کی زبان - داغ کے محاورات -
داغ کا فن - داغ کے تعلقات معاصرین سے - مکتوبات داغ - داغ کی شاعری کا جمالیاتی عنصر - داغ کی معاملہ بندی و محاکات -
داغ کے غیر مطبوعہ خطوط - تلامذہ داغ - داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر - تلامذہ داغ - داغ تذکروں میں - داغ کے خطوط
منی بانی حجاب کے نام - داغ کے یہاں لب و لہجہ کی اہمیت - داغ خطوط کی روشنی میں - داغ و امیر کے تعلقات -
داغ اور رامپور - داغ اور حیدر آباد - انتخاب کلام داغ وغیرہ -

وہ اکابر ادب جو اس میں حصہ لے رہے ہیں :- پروفیسر مجنوں گورکھپوری - پروفیسر فراق گورکھپوری - پروفیسر سرور - پروفیسر
اقتشام حسین - پروفیسر ڈاکٹر نصیر الدین ہاشمی - پروفیسر خواجہ احمد فاروقی - پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی - پروفیسر وقار عظیم -
پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی - پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور - پروفیسر سید صفدر حسین - پروفیسر عطاء الرحمن - پروفیسر اختر انور
پنڈت داتا تریہ کیفی - خلیل الرحمان عظمی - مختار الدین احمد آرزو - پروفیسر اسلوب احمد انصاری - پروفیسر عبدالقادر سروری - مولانا عرو
(رامپور) - محمد علی خاں اثر رامپوری - سراج الدین علی خاں بی۔ اے - وقار خلیل شاہ پوری - سید تکیں کاظمی - کلب علی خاں فانی
رامپوری - علامہ جمیل مظہری - حبیب احمد صدیقی ایم۔ اے - اڈیٹر نگار - یہ سالنامہ نگار کے سالانہ چنڈہ آٹھ روپے سالانہ میں شامل ہے -

ملاحظات

مسئلہ کشمیر اور پاکستان

لائق تعریف ہے "یو۔ ان۔ او" جس نے کشمیر کے مسئلہ میں اپنی بازیگرانہ خصوصیت کو بھر اسی آن بان کے ساتھ قائم رکھا اور سزاوار صد ہزار ستائش ہے "امریکن ہلاک" جس نے اپنے شعبہ کاری سے ہندوستان و پاکستان دونوں

کو باوجود مایوس ہو جانے کے اپنے دائرہ افسوس سے اب تک باہر نکلنے نہ دیا

اس مرتبہ بھی وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے۔ یعنی اول اول باہر گر وہی گرمجوشی کی ملاقاتیں، وہی پرفلوں دعوتیں، وہی دوستانہ معافیت، وہی مخلصانہ مصافحے اور اخیر اخیر وہی سرکہ پیشانیاں، وہی تنی ہوئی گردنیں، وہی آنا کافی، اور وہی۔ "تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں"

سچ ہے غریب گراہم نے کیا نہیں کیا جو وہ کر سکتا تھا، امن و صلح کوشی کا وہ کونسا قدم تھا جو اس نے نہیں اٹھایا، خلوص و صداقت کی وہ کونسی کوشش تھی جو اس کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی، پاکستان و ہندوستان کو ایک مشترک نقطے پر لانے کے لئے وہ کونسی صورتیں تھیں جو اس نے اختیار نہیں کیں اور — "ہانا شراب خور و ہزاہد نماز کرد" کی وہ کونسی ادا تھی جو اس نے صرف نہیں کی — لیکن نہ ہندوستان نے اس کا کہنا مانا نہ پاکستان نے اس کی سنی اور یہ چارہ گر بھر اپنا سامنہ لیکر رہ گیا

لے وادل من، صد وادل من !

بھرا ب کیا ہوگا ؟ — وہی جو ہمیشہ ہوا ہے۔ امریکہ و برطانیہ کے اخبارات اس ناکامی کا سارا الزام ہندوستان و پاکستان کے سر رکھ دیں گے اور یہ دونوں ملک چند دن تک گرا گرم بحث میں مبتلا رہنے کے بعد اپنی قسمت کا فیصلہ بھر یو۔ ان۔ او کے ہاتھ میں چھوڑ دیں گے

نگار یار نہیں ہے، نہ ہو نگار تو ہے !

کس قدر عجیب بات ہے کہ جب کبھی کشمیر کا مسئلہ یو۔ ان۔ او میں زیر بحث آتا ہے تو اسی کے ساتھ یہ خبریں بھی ضرور سننے میں آتی ہیں کہ پاکستان جنگ کے لئے آمادہ ہے۔ آزاد کشمیر کی حکومت حملہ کی تیاریاں کر رہی ہے اور قبائلی علاقہ کے پٹھان یلغار کے لئے بے چین ہیں

اس مرتبہ ابتداءً کچھ سننا سا تھا کہ ذمہ دارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ راولپنڈی نے بھر اس سنت کو تازہ کیا اور اخباروں میں ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے امکان پر رائے زنی ہونے لگی

بعض کا خیال ہے کہ جو بیان اس نے شائع کیا ہے وہ صحیح ہے، بعض اسے پاکستان کا اشارہ قرار دیتے ہیں تاکہ اس طرح یو۔ ان۔ او پر اثر ڈالا جاسکے، لیکن ہم کو ان دونوں باتوں کی صداقت میں شبہ ہے کیونکہ اگر قبائلی قوموں اور

آزاد کشمیر کی جنگی طیاریاں صحیح ہوئیں تو بھی اصولاً پاکستان کو اسے چھپانا چاہئے تھا نہ یہ کہ طشت ازبام کر دینا علاوہ اس کے پاکستان اس قدر احمق نہیں ہو سکتا کہ وہ یو۔ ان۔ او پر اثر ڈالنے کے لئے کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے جس کے کامیاب ہونے کا اول تو خود اسے بھی یقین نہیں اور دوسرے اس کے احساس کمتری کو بھی ظاہر کرنے والی ہو حقیقت یہ ہے کہ امریکی نامہ نگار امریکہ کے ایک خاص گروپ کا ایجنٹ ہے جو چاہتا ہے کہ اس طرح پاکستان کے زخم کو کریڈ کرید کر ہرا رکھا جائے اور وہاں کے عوام میں جذبہ جنگ پیدا کر کے آخر کار پاکستان کو اس راہ پر لا کر کھڑا کر دیا جائے جہاں امریکہ کے ہاتھ پر سبیت کرنے کے علاوہ اسے کوئی چارہ نہ ہو

اس سلسلہ میں پاکستان نے ایک غلطی ضرور کی وہ یہ کہ امریکی نامہ نگار کے بیان کی اسے فوراً تردید نہیں کی اور چند دن گزرنے کے بعد کچھ کہا بھی گیا تو ایسے کمزور اور غیر مدبرانہ لب و لہجہ میں جس سے دنیا کو یہ شبہ کرنے کا موقع مل سکتا تھا کہ اگر آج یہ بات صحیح نہیں ہے تو ممکن ہے کل ہو جائے۔ پاکستان کے پاس اس کا محکمہ اطلاعات ہے، شعبہ نشر و اشاعت ہے، ریڈیو ہے، غالباً اس کی خود اپنی نیوز سروس ہے (اگر نہیں ہے تو ہونا چاہئے) اقوام متحدہ کے محکمہ اطلاعات کا مرکز وہاں موجود ہے اسے چاہئے تھا کہ وہ اس خبر کی تردید فوراً کر دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور آخر کار ہندوستان کو کہنا پڑا کہ اگر کشمیر پر آزاد کشمیر یا قبائلیوں نے حملہ کیا تو وہ پاکستانی حملہ سمجھا جائے گا اور اس کی ذمہ داری پاکستان پر ہوگی

اس میں شک نہیں کہ قبائلی علاقہ پاکستان کے زیر اثر نہیں ہے اور یہ بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ آزاد کشمیر کی حکومت پاکستانی حکومت سے جدا اپنی حیثیت علیحدہ رکھتی ہے، لیکن اسے کون باور کرے گا کہ پاکستان جو ہندوستان سے ٹکرا لینے کے لئے طیار ہے، وہ غیر منظم قبائلی پٹھانوں اور آزاد کشمیر کی فوجوں کو بھی آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتا بہر حال اس مسئلہ میں پاکستان کو نہایت احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے اور اس کی جانب سے کوئی ایسا اقدام جو جنگ کی طرف منجر ہو، حد درجہ خطرناک پالیسی ہوگی

کشمیر کے مسئلہ میں اس وقت ہندوستان اور پاکستان کی پوزیشن **HAVE** اور **HAVE NOT** کی سی ہے، کیونکہ کشمیر کا بہترین علاقہ ہندوستان کے زیر اثر ہے اور جس حصہ پر پاکستان کا اقتدار ہے وہ زیادہ تر غیر آباد اور کوہستانی ہے ایسی صورتوں میں وہ فریق جس کا پلہ جھکا ہوتا ہے، ہمیشہ جنگ سے احتراز کرتا ہے اور دوسرے فریق کا میلان زیادہ تر جارحانہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تو بالکل یقینی ہے کہ خدا نخواستہ اگر اس مسئلہ میں کسی وقت ہندوستان و پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی تو ہندوستان یہ غلطی کبھی نہ کریگا کہ جارحانہ اقدام کا الزام اپنے سر لیکر اقوام متحدہ کو دخل دینے کا موقع دے اور کوریا کی سی فضا یہاں پیدا ہو جانے دے۔ البتہ پاکستان کی طرف سے اس کا امکان ہے کہ وہ تنگ آکر کسی وقت اپنی آستینیں چڑھا لے اور اگر اس نے ایسا کیا تو یہ اتنی بڑی غلطی ہوگی کہ اس کی تلافی شاید کبھی ممکن نہ ہو۔ یہ میں اس لئے نہیں کہ رہا کہ ہندوستان بہ نسبت پاکستان کے زیادہ دوامند، زیادہ قوی اور زیادہ ذریعہ جنگ رکھنے والا ملک ہے (حالانکہ عام طور پر سب سے پہلے اسی بات کو دیکھ کر حکم لگایا جاتا ہے) بلکہ صرف اس لئے کہ پاکستان زیادہ عرصہ تک اس بار کو برداشت نہیں کر سکتا اور جلد از جلد فیصلہ کرنے کے لئے اسے آخر کار کسی ایسی قربانی پر بھی آمادہ ہو جانا پڑے گا جو اسکی کامیابی کو بھی ناکامی میں تبدیل کر دے

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ نہ ہندوستان، پاکستان کو شکست دیکر اس پر قبضہ کر سکتا ہے اور نہ پاکستان

ہندوستان کے کسی حصہ پر قابض ہو سکتا ہے، اس لئے یہ خیال کرنا کہ کشمیر کا فیصلہ جنگ کے ذریعہ سے ممکن ہے صحیح نہیں، کیونکہ کشمیر کی جنگ محض کشمیر کی نہیں بلکہ ہندوستان و پاکستان کی جنگ ہوگی جو کسی ایک مخصوص محاذ تک محدود نہ رہے گی اور اس صورت میں دنیا کی بڑی بڑی قومیں جس فیصلہ پر ہندوستان و پاکستان کو مجبور کریں گی اس کا اندازہ امریکن بلاک کی موجودہ ذہنیت کو سامنے رکھ کر بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں پاکستان کا اس مسئلہ کو ”جارحانہ نقطہ نظر“ سے دیکھنا اس کے لئے کبھی مفید نہیں ہو سکتا۔ اگر اس وقت تک وادی کشمیر پر پاکستان کا قبضہ نہیں ہوا تو وہ تباہ نہیں ہو گیا اور اگر وہ ہندوستان کے زیر اثر ہے تو اس سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ کشمیر جس کے پاس رہے گا ہمیشہ ”قلاوہ در گردن شتر“ بنا رہے گا اور محض بات کی پچ میں یہ عذاب مول لینا کہاں کی دانشمندی ہے

پاکستان کو چاہئے کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کو بالکل بھلا دے، کیونکہ آئندہ جن انقلابات کے آثار یہاں کی فضا میں رونما ہو رہے ہیں ان کا تقاضہ کچھ اور ہے:-

گل و بلبل میں یہ جھگڑا ہے چمن کس کا ہو

کل خزاں آ کے بتا دے گی وطن کس کا ہو

میں یہ اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میرا تعلق ہندوستان سے ہے، اگر میں پاکستانی باشندہ ہوتا تو بھی یہی کہتا اور ہزاروں مخالفتوں کے بعد کہتا کیونکہ میں پاکستان کے قیام سے زیادہ اس کے استحکام کو ضروری سمجھتا ہوں اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ پاکستان تمام بیرونی مسائل سے قطع نظر کر کے صرف اندرونی مسائل پر اپنی توجہ صرف کرے اور کشمیر کے مسئلہ کو خدا پر چھوڑ دے

اس وقت پاکستان نہایت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اندرونی اختلافات، اقتصادی دشواریاں، پیداوار کی کمی، درآمد و برآمد کا عدم توازن، راعی و رعایا کے درمیان عدم اعتماد یہ تمام وہ باتیں ہیں جو اس کی بنیاد کو متزلزل کر دینے والی ہیں اور جب تک ان موانع و خطرات کو دور نہ کیا جائے، اس کا خارجی مسائل پر غور کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا

اس وقت پاکستان کو باتیں بنانے والوں کی نہیں بلکہ کام کرنے والوں کی ضرورت ہے، تکلیف اٹھا کر خدمت کرنے والوں اور صبر و استقلال کے ساتھ مصائب برداشت کرنے والوں کی ضرورت ہے اور اس حقیقت کے سمجھنے والوں کی کہ:-

بایں کہ کعبہ نمایاں شود ز پامنشیں

کہ نیم گام جدائی، ہزار فرسنگ ست

مرزا شوق لکھنوی کا تنقیدی مطالعہ

(از پروفیسر خواجہ احمد فاروقی) مرزا شوق، جان عالم و اجد علی شاہ کے لکھنؤ کے شاعر تھے۔ ان کی ثنوی کا تنقیدی مطالعہ نہ صرف ادب کے محرکات اور میلانات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ اس تہذیبی ماحول کو جاننے کے لئے بھی جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ حکم قضا کو جام شراب کی گردش سے پھیر دیا گیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈیڑھ روپیہ -

منیجر نگار لکھنؤ

شیام موہن لال جگر بریلوی

حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی ایک جانے پہچانے شاعر ہیں۔ آپ نے ۱۸۹۶ء میں ایک معمول اور علم پر درگزر میں جنم لیا۔ بریلی آپ کا آبائی وطن ہے۔ ۱۹۱۱ء میں ڈبلو آئی ایم ہائی اسکول بریلی سے انٹرنش اور ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج بریلی سے بی اے انگریزی ادب فارسی اور فلسفہ میں کیا۔ آپ کے والد صاحب رائے کتھیا لال دل ذی علم اور درویش صفت انسان تھے۔ جگر صاحب نے اپنی تصنیف ”یاد رنگاں“ میں ان کی ایک غزل نقل کی ہے۔ بچپن ہی سے جگر صاحب کی تربیت گھر کے صحیح ماحول میں ہوئی۔ کیونکہ آپ کے والد صاحب عربی فارسی پر کافی عبور رکھتے تھے، شاعر و شاعر سے شوق تھا آپ پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا۔ آپ کی شاعری کی ابتدا بہت چھوٹی عمر سے ہوتی ہے۔

تعلیم کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت نائب تحصیلدار ہو گیا۔ لیکن ملازمت میں آپ ترقی نہیں کر سکے۔ ”مریائے ناز مہیا آستائے“ کے مصداق آپ نے ہمیشہ بجا خوشامد اور دوسری چیزوں سے جو عام طور پر ترقی کا موجب بنتی ہیں پر مہربان کیا۔ عزت نفس کا زندگی بھر خیال رہا ہے۔

زمین پہ ٹیک تو دوں میں جگر جبیں نیاز
نشان سجدہ غم بدل کو ناگوار نہ ہو

انجام ظاہر ہے۔ نائب تحصیلداری سے ملازمت شروع کی، نائب تحصیلداری ہی سے نشن لی۔

فطری شاعر جدا دماغ لیکر دنیا میں آتے ہیں، عام انسانوں کی طرح ان کی پرواز سطح پر نہیں ہوتی۔ ان کی اڑان آواز بند ہی پر ہوتی ہے۔ وہ کچھ سوچتے ہیں، دل میں میٹھی خلش محسوس کرتے ہیں، ایک نامعلوم آئینہ ایک غیر محسوس تحریک ان کو فضاں پر آمادہ کرتی ہے۔ ان کی یہ تخلیق کبھی نہیں ہوتی۔ اس کا خمیر دل کی دھڑکنوں سے طیار ہوتا ہے۔ درخ سورتھ نے بڑے خلوص سے ایک کیفیت کا اعتراف کیا ہے۔ خود جگر صاحب نے ایک شعر میں اس حقیقت کو سمودیا ہے:

سما یا جاتا ہو جیسے کوئی رگ رگ میں دل بن کر
یونہی غم میں کوئی شے اور بھی محسوس ہوتی ہے

اس ”کوئی شے“ کی تلاش و جستجو شاعری کی جان ہے۔ یہ ایک ”ازلی پرتو“ ہے جو شاعر کی طبیعت پر پڑتا ہے۔ ابتدا میں شاعر اپنی حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ کیا ہے کتنا پر عظمت ہے اس کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی کیفیت ایک بچے کی سی ہوتی ہے جو ہر حسین چیز کی طرف ہاتھ پھیلا کر دوڑتا ہے۔ فطرت کے گونا گوں مناظر اس کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اس کے نغمے میں ”انسانیت کی خاموش حزن یہ موسیقی“ نہیں ہوتی۔ اس کے گیت معصوم ہوتے ہیں جگر بریلوی کی نظم ”پہیا“ اس کیفیت کا شاہکار ہے۔ جس طرح کیٹس نے ”ہیمپسڈ“ میں ببل کی آواز سن کر ایک شاہکار نظم لکھی یا درڈ سورتھ نے ”دی گلو“ کی تخلیق کی بالکل اسی طرح جگر بریلوی نے پیپے کی آواز سن کر اس پر نظم لکھی۔ سب پہا بند یہ ہے:

سانے ٹیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آکے کون؟
نالہ کش ہے فرقت دلبر کا صدمہ پاکے کون؟
کون خار درشت و حشت ہے بے دمان ہوش؟
کس کی یہ آواز ہے غازیگر سامان ہوش؟

کردی تھی۔ والد کی درویشانہ سادگی و قناعت، فارسی صوفی شاعری سے غیر معمولی شغف اس پر فطری غم نے جگر کو کھل قنوطی بنا دیا۔ اب وہ ایک خواہش کے تحت جان بوجھ کر غمگین شعر کہنے لگے۔

تیر غم جاناں کا شکار تھے۔ ان کی شاعری میں ان کے غم کا ارتقا ملتا ہے شدت غم میں وہ موت کی آرزو کرتے ہیں۔ انہیں دنیا کی چیزوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ ”ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا“۔ ان کے آنسوؤں میں خلوص کی کھلی ہوئی فولاد ہے۔ وہ غزل کو ایک ایسی نئی سے آشنا کر دیتے ہیں جو آج بھی لاجواب ہے۔ فانی کے غم میں بھی بہت دلکشی ہے لیکن خلوص نہیں۔ انھوں نے غالب کے رنگ میں غم کی آمیزش کی اور کامیاب رہے ورنہ حقیقت یہ ہے وہ نہ غم جاناں کا شکار تھے اور نہ غم جہاں کا۔ جگر بریلوی کا معاملہ ان سب مختلف ہے۔ وہ فطرتاً پر غم تھے اس پر جہاں نے تجدید کی۔ اس سے ان کی غزل میں ایک نئی فضا پیدا ہو گئی جو کامیاب ہے۔ اگر وہ دلہا تھگی کا سودا کرتے اور اکس ناکامیاب رہتے تو شاید ان کی شاعری میں وہ بلندی پیدا نہیں ہوتی جو اب پیدا ہو گئی کیونکہ جنسی چلن ایک حد تک غزل کا روایتی جزو بن کر رہ گئی ہے۔

جگر بریلوی کا نظریہ غم ایک مستقل اور غور طلب چیز ہے۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کے مزاج میں رواقیت اور ان کی طبیعت بابل یہ قنوطیت ہے لیکن وہ تاریکی، زندگی سے بیزاری، زمین اور زمین کے بے والدوں سے نفرت جو رواقیت اور قنوطیت کا لازمی جزو ہیں ان کے یہاں بالکل مفقود ہیں۔ وہ عمل کے قائل ہیں ہر چند ان کے نزدیک عمل ایک ذیلی چیز ہے اور اس سے انسان کوئی بار آور نتیجہ نہیں نکال سکتا کیا خوب کہا ہے۔

جس سے کھل جائے فریب حسن تدبیر و عمل، ایسی بھی اک کوشش ناکام چاہئے

کوشش ناکام ہے۔ انسان کی قوت محدود ہے۔ لیکن اس فضیلت کو جو ناکامی میں پوشیدہ ہے انسان کو حاصل کرنا چاہئے انسان کے اوپر ایک بڑھی طاقت مسلط ہے، اس کو ہم قادر مطلق کہتے ہیں۔ جب تک ”فریب“ ہیر و نگل“ نہیں کھولیں گے بشر قادر مطلق کی قدرت کو تسلیم نہیں کر سکتا و جبکہ زندگی کے اولین مقصد خدا کی لامحدود قدرت کو تسلیم کرتا ہے۔ شاعر یہ جلتے ہوئے بھی کہ تدبیر و عمل حسین فریب ہیں کوشش کا قایل ہے۔

دو چار روز کو ہی کوئی میہانی سہی

شادابی چمن کی بھی تدبیر فرس ہے،

تدبیر نا تمام سہی، رائیگاں سہی

مقصود ہم کو لذت تدبیر تھی سو ہے

تدبیر نا تمام میں ”ذت“ ہے اور ناکامیابی میں فضیلت ہے

وہ تمنا جو پر نہیں آتی

ہے امین وقار عجز و نیاز

دلہر ہے یہ غمگین رجحانات تقدیر کے غنصر خالی نہیں۔ جب کوشش ہمیشہ نا تمام ہو تو انسان کی عظمت معلوم۔ شاعر عمل و مکافات عمل کا کلی طور پر قایل نہیں۔ زمانے کے مشاہدات اور اس کی زندگی کے تجربات نے اعتقاد بدل دیا ہے۔ اب وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے۔

کچھ اور اس کے سوا کائنات نہیں
تقصیر کیا بتائے گرفتار زندگی،
کون کہتا ہے کہ مختار ہوں مجبور نہیں
گناہگار نہ ہوں ہم اگر اختیار نہ ہو
پھر جگر کس نے شرمندہ عصیاں ہو جائے

مزاج حسن کا اک عالم تلون ہے،
آغاز کی خبر ہے نہ انجام کی خبر
زندگی اپنی نہ موت اپنی دل اپنا نہ داغ
وہ جبر ہے جسے سب اختیار کہتے ہیں،
ہے گناہگار یہ پابندی آئین سرشت

شاعر کے نزدیک سب سے بڑی عافیت اسی میں ہے
مثال مردہ چل امواج کے اشاروں پر
کیونکہ وہ خود ایک مضحکہ خیز تعمیر ہے

جو بجز زلیست میں تجھ کو ہے عافیت منظور

موت ہنستی ہے مری ہستی کا سامان دیکھ کر

کچھ ہوا بھردی گئی ہے خاک کی تعمیر میں
جبکہ آل زلیست خدا کی لامحدود قدرت میں گم ہو جانا ہے

خداے حسن یوں ہونا کہ خود تصویر ہو جانا

آل زندگی ہے عشق کی تعبیر ہو جانا
اور گم ہو کر ہماری مجبوریوں کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ مصائب کا سلسلہ جاری رہتا ہے

موج دریا ہیں ہمارا کیا، کبھی مٹنا کبھی اُبھرنا ہے

اس کے باوجود وہ زلیست کی عظمت کے قایل ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ روشن ہے جو دوسروں سے ان کو ممتاز اور بلند کرتی ہے

عظمت زلیست سمجھتا ہے جگر موت کا خواستگار ہوتا ہے

جگر بریلوی کی غزل تضاد سے مبرا ہے۔ اس کی شخصیت جامع اور زندگی کے ایک ہی تصور کی حامل ہے۔ انکا زندگی کے متعلق ایک مستقل اور سوچا سمجھا تصور ہے۔ ان کی غزل میں یہ تصور جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل سے انکا تعلق روحانی ہے

غزل سے لے جگر اندازہ کر مری حقیقت کا غزل میں کیفیت کچھ روح کی محسوس ہوتی ہے

اور جب غزل میں شاعر اپنی شخصیت سمو دیتا ہے، ایک ایسی شخصیت جو بلند ہو تضاد سے غالی ہو تو غزل میں وہ عظمت پیدا ہوتی ہے جو دیوتاؤں کی ہی تقدیر ہو سکتی ہے۔ جگر بریلوی کی غزل میں بے پناہ خلوص ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں محسوس کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ شعر میں ان کی روح تڑپتی ہے۔ ان کے درد میں پورا خلوص ہے

میں ہر سہ سانس پر رو رو دیا ہوں
اٹھتا ہے خود بخود قدم دشت میں خار دیکھ کر
زلیست کا راز کھول کر موت کا آسرا دیا
کچھ آگ کے سوا مرے دل میں جگر نہیں
کچھ عجب حال ہوا ہے ترے سودائی کا
جنوں کا پاس غم دل کا احترام رہا
پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے
غم ہی غم دہر میں ہے غم کے سوا کچھ بھی نہیں
کس دل سے سر جھکائے وہ تیری بندگی میں

نہ پوچھو زندگی کس طرح گزری
میری سرشت ہی میں ہیں رنج پسندیاں بھری
بخیر حیات تھا غم نے مجھے جگا دیا
کیسی دعا کہاں کا اثر کس کا دعا
بات کرتا ہے اگر کوئی تو درد اٹھتا ہے
اٹھا سکے نہ ہم احسان شادمانی کا
نہ جانے زخم دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی
گر خدا ہے بھی تو مقدور خدا کچھ بھی نہیں
جس نے کبھی نہ راحت پائی ہو زندگی میں

اور ذرا اس حالت کو دیکھیے

یہی دل چاہتا ہے ہم بھی روئیں
کس نے بنا کے سخت ہاں سینے میں دل بنادیا

کسی کو دیکھ لیتے ہیں جو روتے
موت کہیں نہیں ہمیں اور کہاں نہیں ہے موت

اور

جگر بریلوی کی پر عظمت شخصیت ان کے تمام کلام میں رواں دواں ہے۔ وہ بے حد پاکباز ہیں ان کی شاعری میں نہ محبوب سے چھپڑ چھاڑ کے مضامین ہیں اور نہ عشق و محبت کی گھاتیں وہ سطح سے بہت بلند ہو کر کہتے ہیں۔ انھوں نے غزل کی بہت بلندی سے نکالی ہے لیکن یہ محض تخیل کی پرواز نہیں۔ ان کو اپنے خیالات پر پورا قابو ہے کیونکہ وہ خود ہمارے ہیں اپنی منزل اور اپنے راستے سے واقف ہیں اور جب کلام میں تضاد نہیں ہوتا۔ تخیل کی بے راہ روی نہیں ہوتی، خلوص کے آئینوں کی چمک اور سوچی سمجھی باتوں کی وضاحت ہوتی ہے تو شعر میں آہستگیوں جیسی نزاکت پیدا ہو جاتی ہے جگر بریلوی کی غزل فنی اعتبار سے بھی اتنی مکمل ہے کہ کسی بھی شعر کا ایک لفظ نہ تبدیل کیا جاسکتا ہے نہ اپنی جگہ سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ آپ کی غزلوں میں غیر معمولی نجنگی ہے۔ اور اس پر غم کی مدھم لے۔

دل ہے سینے میں تو غم سے عہد و پیمان کیجئے
موت کے دربان سے بیٹنے کا ساماں کیجئے
کفر کو قربان یا ایماں کو قرباں کیجئے
ہوسکے تو دل میں پیدا درد انساں کیجئے
کیف بن کر عرسہ کو نین پر چھپا جائے
دل کو یوں محو خیال روئے جاناں کیجئے
بخشے چشم خماریں سے کبھی کیف و سرور
راہ و رسم زندگی مشکل ہے آساں کیجئے
عاشقی جدت طلب دارد رسن رسم قدیم
کیا کہیں کیونکہ سرد گردن پہ احساں کیجئے
دیکھئے پھر جلوہ رنگینی حسن و جمال
دل کے ارمانوں کو نذر سوز پنہاں کیجئے

حق محبت کا ادا کرنا جگر آساں نہیں

دیکھئے دل میں شکاف اور لب کو خنداں کیجئے

دم توڑ دیا تمک کر کیا میند اسے آئی پھر
آزردہ منزل بھی آسودہ منزل صفتا
خاموش ہوئیں شمعیں بیتاب ہوئے پردانے
کچھ ذکر جگر تیرا نکلا سر محفل صفا
دل سے باہر ہوں بگر یا اختیار ملیں ہوں
اب نہیں معلوم مجھ کو کونسی منزل میں ہوں
ابھی دیوانگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے
ابھی اس شدت غم زندگی محسوس ہوتی ہے
شب فراق تھی یہ غم کی محویت جیسے
وہ دنواز جگر ہم سے ہمکلام رہا
پھر عندلیب زار نے تنکے اٹھائے
شاید چمن اجڑنے کی اس کو خبر نہیں
زمانہ میں بھی اک انداز بے نیازی ہے
مری جبین کو کوئی آستان نہیں ملتا
دل نے ازل میں کہ کے یہ دیرانہ لے لیا
کس سے اٹھیں گے ناز چمن میں بہار کے
پریش آزدگانِ غم کی قدرت بھی نہیں
دل سے کہتے ہیں دم نکلتا ہے
حجاب اک رمز محبوبی ہے حسن جلوہ ساماں میں
نصیب سے مرے پہلو میں دل بیکل آیا
دریائے محبت ہے میں ہوں کیفیت وستی ہو دل ہو
وہ مری معصومیت اور جوش رحمت وہم تھا لیکن
عقل سے حاصل ہوا کچھ تو یہ حاصل ہوا
لا رہا ہوں انھیں تصور میں
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

جملک کر رہ گئیں رنگینیاں گلہائے خنداں میں
وگر نہ دور بہت بارگاہ ہے تیری
کچھ فکر نہیں ساحل کی اس دریا کا ساحل ہی نہیں
وہ میرا ترے آگے پیکر تقسیم ہر جانا
اک اذیت بن گئی زندان میں آزادی مجھے
اپنے خاکے میں رنگ بھرتا ہوں

دیکھی ہیں ہم نے ان کی تلون مزا جیاں
بے پرستی کسی عالم میں نہ چھوٹی ہم سے
ضبط غم بھی محال ہے ہم سے
دل کے ہر ذرے کو پہنائے دو عالم کیجئے
لیجئے تابانی عالم کے سامان ہو گئے
اسرار محبت سے آگاہ مرا دل تھا
کیا فائدہ رونے دھونے سے جب اسکا کچھ حال نہیں
پہلے کر عشق مجازی تا حقیقت ہو عیاں
گزرے ہیں ہم یہ دور بہار و خزاں کئی
ہر تصور مرا تصویر بدامان نکلا
اور فریاد بھی نہیں ہوتی
پھر یہ ممکن ہے خیال دعوت غم کیجئے
دل کے ذرے اڑ کے ہر جانب پریشاں ہو گئے
جو درد تھا رہبر تھا جو زخم تھا منزل تھا
کیا درد سنائیں اپنا ہم سینے میں تھا دل ہی نہیں
راہ مشکل ہے سفر منزل بہ منزل چاہئے

حضرت جگر بریلوی کی شاعرانہ صلاحیتیں غیر معمولی ہیں۔ بد قسمتی سے وہ اچھی طرح منظر عام پر نہیں آ سکے۔ انکی درویشانہ طبیعت ہر قسم کے نام و نمود سے بچتی رہی لیکن وہ ایک مکمل شاعر ہیں اور ایک انفرادی مقام کے مالک۔
بالیدگی روح ہے یا جلوہ نگار،
پھرتا ہے کوئی ساتھ گلستاں لئے ہوئے
لطیف حسین ادیب ام۔ لے

نگار بک کینی کی کتابیں

اردو کے ساتھ چھپتی قیمت
چنگی آنا چاہئے

اردو کے ساتھ چھپتی قیمت
چنگی آنا چاہئے

دور جدید کے مختلف ہندو شعراء = عبدالشکور ام۔ ۱۔ ۷۷
چھان بین (تنقید) = اثر لکھنوی۔ ۷۷
آپ بقا (تذکرہ شعراء) = عشرت لکھنوی۔ ۷۷
ہندو شعراء (تذکرہ) = عشرت لکھنوی۔ ۷۷
لغات المصادر اردو = عشرت لکھنوی۔ ۷۷
شاعری کی چار کتابیں = عشرت لکھنوی۔ ۷۷
اردو کی عشقیہ شاعری = فراق گورکھپوری۔ ۷۷
مشعل = انتخاب کلام فراق گورکھپوری۔ ۷۷
حاشیہ و تنقید = فراق گورکھپوری۔ ۷۷
افادۃ الاسلام (رد قادیانیت)
علامہ انوار اللہ شاہ۔ ۷۷

محاسن کلام غالب = از ڈاکٹر بجنوری مرحوم۔ ۷۷
حیات سرسید = از نور الرحمن بی۔ ۷۷
حیات اجمل = از قاضی عبدالغفار (مجلد)۔ ۷۷
یادگار حالی = از صالحہ عابد حسین۔ ۷۷
ادبی وقوف تذکرے = از پنڈت کشن پرشاد کول۔ ۷۷
مراوا = فرقت کی طنزیہ نظموں کا مجموعہ۔ ۷۷
مقدمہ شعر و شاعری = از حالی۔ ۷۷
نقد الادب = از حامد اللہ آفر۔ ۷۷
ناول کی تاریخ و تنقید = از علی عباس حسینی۔ ۷۷
تاریخ امریکہ = از محمد کینی تنہا۔ ۷۷
ادبی تبصرے = از مولوی عبدالحق صاحب۔ ۷۷

گاہ گاہ باز خواں !

اقبال کا فلسفہ خودی

(عملی نقطہ نظر سے)

بانی اسلام کی وہ تعلیم جسے ہمارے موجودہ علماء اسلام نے سب سے کم سمجھا

ہمارے علماء ہمارے قایدین ملت اور ہماری جماعت کے وہ تمام افراد جو محراب و منبر کی بلندی سے صدائے موعظت بلند کرنے کا حق رکھتے ہیں، اگر ان سب کی پسند و نصیحت میں کوئی چیز "قدر مشترک" کی حیثیت سے نظر آتی ہے تو صرف یہ تعلیم کہ مسلمان اس وقت تک صحیح مسلمان نہیں بن سکتا جب تک وہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے نہ ہٹے لیکن یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس سے کیا مقصود ہے۔

ظاہر ہے کہ اس تعلیم و تلقین کے سلسلہ میں سب سے پہلے "خیر القرون قرنی" کی تصویر ان کے سامنے آتی ہوگی اس کے بعد صحابہ کا دور پیش نظر ہوتا ہوگا اور پھر تابعین و تبع تابعین کا۔ لیکن آپ کسی مولوی سے دریافت کیجئے کہ وہ عہد نبوی کو تاریخ انسانی کا کیوں بہترین دور قرار دیتا ہے تو وہ اس کا سبب بجز اس کے اور کچھ نہ بتا سکے گا کہ اس وقت صدائے توحید بلند ہو رہی تھی۔ صنم کدے دیران کئے جا رہے تھے لوگ خشوع و خضوع سے نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے اور محض رسول اللہ کا دیدار ہی نجات کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد وہ دور صحابہ کی برکات کا ذکر کریگا کیونکہ یہ زمانہ عہد نبوی سے زیادہ قریب تھا پھر وہ تابعین کے زمانہ کی تعریف کرے گا اور صرف اس بنا پر کہ اس عہد کے لوگوں نے صحابہ کو دیکھا تھا اور پھر تبع تابعین کا ذکر کرے گا کیونکہ انھوں نے تابعین سے فیض صحبت حاصل کیا تھا۔ الغرض ایک مولوی کے سامنے وقت و زمانہ کی خوبی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ عہد نبوی سے اس کا بہت زیادہ بعد نہ ہو۔ چنانچہ دنیا جتنی آگے بڑھتی جائے گی اتنی ہی خراب ہوتی جائے گی۔ پھر حیرت ہے کہ جب ایک زمانہ کی سعادت و عدم سعادت صرف اس پر منحصر ہے کہ وہ کسی مخصوص انسان سے قریب واقع ہے یا دور، ہم پیچھے ہٹ کر کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جبکہ وہ انسان کسی طرح واپس نہیں آسکتا اور ہم اس کے دیدار سے دوزخ اپنے اوپر حرام نہیں کر سکتے۔

میرا مقصود اس تمہید سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کے لئے جو تدابیر قایدین مذہب کی طرف سے بتائی جاتی ہیں وہ مقالہ خواہ کتنی ہی شاندار و امید افزا کیوں نہ ہوں لیکن معنایکسر لغو و مہمل ہیں، ایک واعظ صدائے توحید کا ذکر کرتا ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کو ایک کہہ دینے سے انسان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ کفر و بت پرستی کے استیصال کا کارنامہ نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے مگر میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ پتھر کی چند مورتوں کو توڑ دینا کیوں انسانیت کا متہائے

ترقی قرار دیا جائے، وہ نماز و روزہ کی متضرعانہ کیفیت کا فسانہ دہراتا ہے لیکن میں حیران ہوں کہ جنبش اعضاء کی چند مقررہ صورتیں اور فقر و فاقہ کی تنگی کو کیوں سعادت انسانی سمجھا جائے، وہ صرف رسول اللہ کے دیدار کو کافی ذریعہ نجات قرار دیتا ہے، درانحالیکہ رسول کے دیکھنے والے اگر ایک طرف ابوبکر و علی تھے تو دوسری طرف بوجہل و بولہب بھی پائے جاتے تھے گو یہ فرق ضرور تھا کہ جنھوں نے اخروی نجات حاصل کی ان میں شاید جذبہ صنم پرستی موجود تھا اور جو گمراہ کہلائے وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مجھ سے اگر سوال کیا جائے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں سب سے بہتر زمانہ کون سا تھا تو میں بھی بلا تامل عہد نبوی کا نام لے دوں گا لیکن اس کا تعلق رسول اللہ کی ذات سے ہوگا نہ اُن کے دیدار سے بلکہ صرف اس روح سے جو اس انسان کامل نے پیدا کی اور اس عزم و ارادہ سے جس نے ایک پست و جاہل قوم کو دفعتاً قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ ترقی پر پہنچا دیا۔

یقیناً رسول اللہ نے توحید کا درس دیا لیکن اس سے مراد محض خدا کو ایک کہنا یا سمجھنا نہ تھا کیونکہ صرف یہ عقیدہ انسانی ترقی یا فلاح کو مستلزم نہیں بلکہ اس سے مراد ایک عام جذبہ اتحاد و اخوت کو بیدار کرنا تھا، تمام نوع انسانی کو ایک رشتہ اجتماعیت سے وابستہ کرنا تھا اور اس قوت برتر و اعلیٰ میں ضم ہو کر (جو یقیناً ہر ہرزہ میں کار فرما ہے) ایک ایسی جمیل فضا پیدا کر دینا تھا، جہاں خدا سمٹ کر انسان اور انسان پھیل کر خدا بن جاتا ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ رسول اللہ نے کفر و بت پرستی کے فلات پوری جدوجہد سے کام لیا لیکن کفر سے مراد خودی کا انکار تھا، انانیت کبریٰ سے اعراض تھا اور بت پرستی نام تھا اس کو رانہ تقلید و جاہلانہ سرنگینی کا جو ایک انسان سے احساس انسانیت و برتری چھین لینے والی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ سرکار نبوت سے طاعت و عبادت کی بھی ہدایت کی گئی لیکن اس کا مطمح نظر صرف اس قوت کو سراہنا تھا جو نظام کائنات کو تکمیل و تجمیل کی طرف لے جا رہی ہے اور اس سے کس فیضان کر کے خود اس قوت کا دست و بازو بن جانا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین پر سرٹیک دینے سے نہ خدا کے مرتبہ میں کوئی بلندی پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اس عجز و فروتنی کی اسے ضرورت

الغرض یہ بالکل صحیح ہے کہ عہد نبوی بہترین زمانہ تھا، لیکن اس کا تعلق نہ صرف روزہ نماز سے تھا نہ ظاہری مراسم نیایش و عبادت سے، نہ زبانی تسبیح و تہلیل سے اسے کوئی واسطہ تھا، نہ مسواک و مصلیٰ سے بلکہ وہ ایک زمانہ تھا جس نے سوئی ہوئی انسانیت کو جگایا، جس نے فطرت کے قوائے کامتہ کو انسان کے لئے بے نقاب کیا اور جس نے نوامیس الہیہ کو دسترس انسانی سے قریب تر کر کے عالم کی ذہنیت کا رُخ بدل دیا۔

پس یقیناً وہ عہد نہایت مبارک عہد تھا، جب آفتاب حقیقت نے اول اول اس طرح طلوع کیا اور لاریب وہ زمانہ سراپے جانے کے قابل ہے جب شاہد مقصود سب سے پہلے برا فکندہ نقاب سامنے آیا، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ابتدا کو کسی انتہا کی ضرورت نہ تھی، یہ آغاز انجام سے بے نیاز تھا، اس آفتاب کا طلوع نصف النہار سے مستغنی تھا تو یہ اس کا دعویٰ غلط ہوگا، کیونکہ دنیا کا کوئی تخم دفعتاً بار آور نہیں ہو سکتا کوئی تعمیر فوراً استوار نہیں ہوتی اور منزل تک پہنچنے کے لئے قطع سفر ضروری ہے رسول اللہ نے بیشک انسانیت کے دور جدید کی بنیاد قایم کی لیکن اس توقع کے ہرما تھہ کہ آئندہ نوع انسانی اس کو عروج و کمال تک پہنچائے اور خدا کا وہ وعدہ جو "جنات عدن" کی صورت میں کیا گیا تھا پورا ہو کر رہے۔

پھر اب دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ کس قوم نے اس رمز کو سمجھ کر ان مدارج استعلاء کو حاصل کیا جو ایک سچے مومن و مسلم کو حاصل کرنا چاہئے اور وہ کون سی قوم ہے جو اس تعلیم کو نظر انداز کر کے - "ہل یہلک لہ القوم الفاسقون" کی تعزیر میں مبتلا ہوئی۔

یہ ہماری کوتاہ نظری ہے اور ہم خدائی فیصلوں اور ربانی اصول میں ملک و ملت، رنگ و نسل، کفر و اسلام کی تفریق کو سامنے رکھ کر خطا و صواب کا معیار قائم کرتے ہیں، جو فطرت مشرق میں جلوہ گر ہے وہی مغرب میں ہے، قدرت کی جو کار فرمایاں شمال میں نظر آتی ہیں، وہی جنوب میں بھی ہیں، شاہراہ صوفیہ ایک ہی ہے جس کا دوسرا نام دین فطرت اور یہ سب کے لئے یکساں کھلی ہوئی ہے یہود و نصاریٰ کافر و مسلمان کی تفریق صرف ہماری بے بصری کا نتیجہ ہے اور یہ نام وہ ہیں جو خدا کی لوح محفوظ یعنی صحیفہ قدرت کے اوراق میں کسی جگہ نظر نہیں آتے، وہاں ان سب کو صرف ایک ہی نام لفظ "انسان" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس کے لئے صرف ایک ہی پہچان "کل مولود ولد علی فطرۃ الاسلام" بتائی گئی ہے اور یہ منحصر صرف بانی اسلام ہی کو حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے اس راز کو ظاہر کیا اور اس طرح اس نے اول اول جملہ افراد نوع انسانی کو ایک ہی منزل کی طرف قدم بڑھانے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کی تعلیم دی۔ لیکن ہماری کوتاہ فہمیوں کی یہ داستان کتنی دردناک ہے کہ جس قوم پر سب سے پہلے اس راز کا افشا کیا گیا اسی نے سب سے زیادہ اس کو ٹھکرایا اور انسانیت کو جس جماعت سے سب سے زیادہ "توقع داد پانے" کی تھی وہی سب سے زیادہ "خستہ تیغ ستم" ٹکلی۔

اب سے اربوں سال قبل جس کرۂ ارض کی تخلیق ہوئی تھی، ہر چند وہ مہوز تشہ تکمیل ہے، لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ اس کے شباب و بلوغ کا زمانہ آ رہا ہے اس کی تحسین و تجمیل آہستہ آہستہ مکمل ہو رہی ہے اور اس شراب کے رسا ہونے میں زیادہ دیر نہیں ہے، علوم و فنون کے چشمے ہر طرف ابل رہے ہیں، کائنات کے تمام چھپے ہوئے راز کھلتے جا رہے ہیں، قدرت کے جملہ برکات ہمارے لئے یسیر الحصول ہوتے جاتے ہیں، عناصر عالم نے انسان کے سامنے سراطاعت خم کر دیا ہے "استخلاص فی الارض" کا وہ وعدہ ربانی جو یوم الست میں کیا گیا تھا بہت جلد پورا ہونے والا ہے اور دنیا ایک زمانہ دراز تک انتظار کے جہنم میں پھٹکنے کے بعد قرب و وصال کی فردوس سے ہم آغوش ہونے والی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ سعادت و برکت ان کے لئے مقسوم ہے نہیں جنہوں نے دنیا کو "سجن المومن" سمجھ کر اس کو ٹھکرا دیا بلکہ ان خوش نصیب لوگوں کا حصہ ہے جنہوں نے اس قید خانہ کو اپنے لئے رشک فردوس بنالیا خواہ اس کا نام آپ "جنت الکافر" ہی کیوں نہ قرار دیں۔

انسان اسی دنیا کا ایک جزو ہے اور اسی کو آباد کرنے کے لئے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ قدرت نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ وہ یہاں مفلوج و عاجز، بیکس و مفلس، نادار و ناچار، محتاج و بیمار بن کر زندگی بسر کرے، دنیا خدا کا ایک باغ ہے جس کو اس نے پھولنے اور پھلنے کے لئے نصب کیا تھا نہ کہ دیران و ہر باد ہونے کے لئے پھر جن کو چشم بصیرت عطا ہوئی ہے وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ موسم بہار کی ہوائیں چلنا شروع ہو گئی ہیں، دور خزاں ختم ہو چلا ہے تازہ کوئیں بھوٹ رہی ہیں، گلہائے رنگارنگ منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو رہے ہیں اور بہت جلد خود ذات ربانی اس کسوت نشاط و جمال میں رونما ہونے والی ہے جسے دست انسانی نے اپنے خالق کے لئے طیار کیا ہے۔ خدا غنی ہے اور وہ اس کا جہان نہیں ہو سکتا جو محتاج و مفلس ہے۔ خدا غالب و قدیر ہے اس لئے وہ مغلوب و مفتوح کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ خدا پاکیزہ و طاہر ہے اس لئے وہ کیشف و بد سلیقہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، خدا اجل و اکمل ہے اس لئے وہ ناقص و بد صورت سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو اس نے پیدا کیا

ہے اسے مکمل دیکھنا چاہتا ہے۔ اسے نقص سے نفرت ہے، بد صورتی سے احتراز ہے، حسن و بلال سے استکراہ ہے اور اس لئے وہ قومیں جو در ماندہ و عاجز ہیں، مغموم و ملول ہیں، یقیناً وہی ہیں جن کی طرف سے اس نے اپنا منہ پھیر لیا ہے اور جو قومیں غالب و فاتح ہیں، مسرور و شاد کام ہیں، بیشک وہی ہیں، جن سے خدا خوش ہے اور جن کو وہ دوست رکھتا ہے۔ اس دنیا میں ایک تشائم (Pessimism) سے سنسکا قوم کو زندہ رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، وہ جماعت جو اپنی کاہلی اور قوت عمل کے فقدان کو "تقدیر و توکل" کے نام سے موسوم کر کے گرایانہ زندگی بسر کر رہی ہے وہ یقیناً ہلاک ہو کر رہے گی اور اسے ہلاک ہو جانا چاہئے۔ دنیا فطرت کا وہ کارنامہ ہے جس میں اس کی انتہائی تمنائے نشاط صرف ہو رہی ہے اور اس لئے ایک حزیں و مایوس ہستی کا اس میں گزر نہیں۔ باغ کے وہ تمام پودے جو بیمار ہو کر مضمحل ہونے لگتے ہیں ان کو اکھاڑ کر پھینک دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے صحیح و توانا درخت متاثر نہ ہوں، بالکل اسی طرح وہ جماعتیں بھی فنا ہو جائیں گی، جن کے قواء مضمحل، جن کے دماغ ضعیف اور جن کی ذہنیتیں بیمار ہیں تاکہ خدا کی یہ کھیتی لہلہا اٹھے اور اس کی زمین تمام خس و فاشاک سے پاک ہو جائے۔

نگار بک کمپنی کی کتابیں

آرڈر کے ساتھ چغتائی قیمت پیشگی آنا چاہئے

عظیم بیگ چغتائی کے ناول

جنت کا بھوت	۱۲
فل بوٹ	۸
لفٹنٹ	۸
شریہ بیوی	۸
آر دوسے قدیم	۸
شمس اللہ قادری	۸
تنقیدی مضامین	۸
اثر لکھنوی	۸
تاریخ مغربی یورپ	۸
تنہا بی۔ اے۔	۸
امیر احمد علوی	۸
دیوان درد	۸
دیوان ظفر	۱۲
سیرۃ آل عباس	۸
از سید فرید	۸
سیرۃ النعمان	۸
شبلی	۸
سیرۃ مصطفیٰ کمال	۸
قصاید فدق	۸
تذکرہ کا ملان رامپور	۱۲
شوق رامپوری	۸

مرآۃ محمدی (تاریخ گجرات)	۸
مشاطہ سخن (اساتذہ کی اصطلاحیں) صفدر مرزا پوری	۸
شرح کلام غالب	۸
آسی	۸
دیوان رنگین	۸
راچیوت اور منغل زن دشو کے تعلقات	۸
از محمد فی	۸
رمز و کنایات	۸
فراق گورکھ پوری	۸
بچوں کی کتابیں	۸

آخری نبی : ۶	۸
سرکار کا دربار	۸
پڑوسی : ۸	۸
رات کی رانی	۸
لطائف اکبر و ہیرلی : ۸	۸
پانچ قوتیں	۸
ٹھکوں کا استاد : ۳	۸
زہرہ پری : ۵	۸
بے رحم بادشاہ : ۴	۸
انقلابی مولوی : ۵	۸
سفید کبوتر	۲
سگھر سہیلی	۲
آنحضرت	۸
نقلی شہزادہ	۲

فارسی ادب کی تریخی عروج و زوال

اس وقت ہمارا موضوع گفتگو فارسی زبان کی تاریخ پیش کرنا نہیں ہے (اس مسئلہ پر ہمارا ایک بسیط مقالہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے جو انتقادیات جلد اول میں شامل ہے) بلکہ مدعا صرف یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی فتوحات کا ایرانی ادب پر کیا اثر ہوا اور اس اثر کے تحت اس کے رجحانات اور میلانات میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں جس وقت عربوں نے ایران پر حملہ کیا، یہاں کی زبان پہلوی تھی۔ یہ زبان زند و آوستا کی زبان تھی اور اس کا تمام سرمایہ ادب (جن کا تفصیلی علم ہم کو حاصل نہیں ہے) اسی زبان میں محفوظ تھا، لیکن عرب اور عربی زبان ایرانیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ عرب و ایران کے دیرینہ تعلقات کی تاریخ ظہور اسلام کی تاریخ سے زیادہ قدیم ہو کیونکہ جنوبی حصہ عرب میں ساسانیوں کی حکومت عرصہ سے قائم تھی اور شاپور اول کے عہد میں بہت سے عرب خاندان جنوبی ایران میں آکر آباد ہو گئے تھے

سب سے پہلے ایران میں مسلمانوں کا فاتحانہ اقدام حضرت عمر کے زمانہ میں ہوا اور جب جنگ قادسیہ میں (۶۳۶ء) ساسانیوں کی تخت گاہ مدائن پر ان کا قبضہ ہو گیا تو ایرانی حکومت کو اپنے زوال کا یقین ہو گیا اور اس احساس نے ایرانیوں کو اس درجہ کم ہمت بنا دیا کہ حضرت عثمان کے زمانہ تک صرف چودہ پندرہ سال کے عرصہ کے اندر ان کی مملکت کا بڑا حصہ مسلمانوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ پھر چونکہ حکمران قوم کی زبان و لہجہ کا اثر ہر محکوم قوم پر بہت گہرا ہوتا ہے، اس لئے قدرتا ایران کو بھی اسے متاثر ہونا پڑا تھا اور آخر کار یہاں کے پہلوی لٹریچر میں بھی انحطاط و زوال کے آثار شروع ہو گئے اور فتح ایران کے بعد سو سال کے اندر ہی اندر عربی زبان کا اثر ایران پر اس قدر قوی ہو گیا کہ خود ایران کے شعراء و ادباء نے عربی زبان میں کتابیں لکھنا شروع کر دیں اور انیسویں صدی تک خراسان و ماوراءالنہر تک ایران کے تمام اونچے گھرانوں کی زبان عربی ہی ہو گئی۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ایران کی جماعتوں نے خوشدلی کے ساتھ عربوں کی حکومت اور اس کے اثرات کو قبول کر لیا تھا۔ وہاں ایک سیاسی عنصر ایسا بھی تھا جو عربوں کے اس جوئے کو اپنی گردن سے علیحدہ کر دینا چاہتا تھا اور جب رفتہ رفتہ خلافت کے اثرات ضعیف ہونے لگے تو سیاسی اضطراب کے ساتھ لسانی اضطراب بھی پیدا ہوا اور فارسی لٹریچر میں نشاۃ الثانیہ کے آثار نمودار ہوئے

اس وقت تک عربی لٹریچر کے اثرات ایرانی لٹریچر پر اس قدر وسیع ہو چکے تھے کہ نہ صرف اسلوب شاعری بلکہ عروض میں بھی عربی شاعری کا تتبع کیا جاتا تھا، اس لئے بڑا مشکل تھا کہ ان اثرات کو یک لخت مٹا دیا جاتا۔ پہلوی زبان تو بالکل مردہ ہو چکی تھی اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا ممکن نہ تھا، اس لئے ایرانیوں نے عربی زبان کے مقابلہ میں فارسی زبان کو ترقی دینا چاہی اور اس میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس سے قبل یہاں کے شعراء عربی ہی میں شاعری

کرتے تھے لیکن اب یہ اس میں فارسی کے الفاظ بھی شامل کرنے لگے اور رفتہ رفتہ عربی کے بوجھ کو ہلکا کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا وہ بالکل فارسی زبان میں تھا، (اسے فارسی کی قدیم ترین نظم کہا جاتا ہے) اس کے بعد ایران میں چند شعراء (ابوحفص سغدی - خطلہ - محمود دزاق - فیروز مشرقی - ابوسالک گورکانی وغیرہ) اور بھی ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار فارسی ہی میں کیا۔

الغرض خلافت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی ترقی کرتی رہی اور دسویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان جب کہ حکومت خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر متعدد خود مختار حکومتیں علاوہ علیحدہ قائم ہو گئیں، فارسی شاعری درباروں تک پہنچ گئی اور انھیں درباروں کی قدر دانی کی وجہ سے وہ آگے بڑھتی رہی اور امراء کے ذوق و میلان کے مطابق اس میں خیال و اسلوب دونوں طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

ان درباروں میں طاہری اور صفاری خاندانوں کا نام سب سے پہلے آتا ہے، لیکن فارسی کی ترقی زیادہ تر سامانی دربار میں ہوئی جو شاعروں کا بڑا قدر دان تھا۔ رودکی سمرقندی جو فارسی شاعری کا ابوالآباء سمجھا جاتا ہے اسی دربار کا شاعر تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی چند شعراء اس زمانہ میں ایسے پیدا ہوئے جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا مثلاً معروف بلخی ابو شیبہ ہروی، ابو زرہ جرجانی، ابوطاہر خسر دانی، جوئباری بخاری، رونقی، معنوی اور عمارہ مروزی وغیرہ۔ ان شاعروں کا فن امراء وقت کی مدح میں قصیدہ گوئی کرنا تھا اور اسی فن میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش ان کا مقصد نظر تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک دوسرے کی ہجو بھی کی، استہزاء سے بھی کام لیا (کیونکہ امراء دربار اسی سے خوش ہوتے تھے) اور اس طرح گو زبان کے لحاظ سے شاعری کو کافی ترقی ہوئی لیکن اس میں کوئی معنوی بلندی پیدا نہ ہو سکی۔

سامانیوں کے زوال کے بعد یہ ادبی مرکز بغداد سے غزہ منتقل ہو گیا جہاں اس وقت سلطان محمود حکمران تھا، اس کی محفل شعراء کا "گل سرسبز" عنصری بلخی تھا جس نے اپنے قصاید میں یہ بدت پیدا کی کہ محمود کو سلطان وقت ثابت کرنے کے لئے شاعرانہ مدح سے ہٹ کر فقہی موٹگافیوں سے بھی کام لیا۔ سلطان محمود کا بھائی امیر نصر بھی شعراء کا بڑا قدر دان تھا لیکن اس کے دربار میں وہی سامانی عہد کی شاعری کا سماں پایا جاتا تھا۔ اس کے درباری شعراء میں ایک منوچہر ہی تھا جو ہنسے کھیلنے والا رند قسم کا شاعر تھا اور اپنی تلمیحات میں زیادہ تر روایات قبل اسلام سے کام لیتا تھا، دوسرا فرخی سیستانی تھا جسے عربی کے مشہور شاعر متنبی کا ہمسر سمجھا جاتا ہے اور خیال کی بلندی و نزاکت کے لحاظ سے واقعی اپنا جواب نہ رکھتا تھا، تیسرا شاعر اسدی طوسی تھا جس نے سب سے پہلے قصاید میں مناظرانہ قسم کی تشبیب سے کام لیا سلطان محمود کے جانشینوں کے زمانہ میں گو سلطنت کمزور ہو گئی تھی پھر بھی ان کے دربار شاعروں سے خالی نہ رہتے تھے۔ جس میں ابوالفرج رودنی جو قصیدہ گوئی کا بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور اس کا شاگرد مسعود سعد سلمان خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ عثمان مختاری بھی اس عہد کا ممتاز شاعر تھا جس کے کلام میں عالمانہ جھلک بھی پائی جاتی تھی بویہ دربار کے ملاہوں میں ایک شاعر قطران صبیلی تھا جو ہر چند فرمانروائے آذربائیجان کا ملازم تھا لیکن بویہ فرمانرواؤں کی مدح میں بھی اس نے قصاید لکھے۔ عرصہ تک اس کے کلام کو رودکی کا کلام سمجھا گیا۔ ایک خانیوں کے دربار میں بھی فارسی شاعری کو خاصہ فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد کے ممتاز شاعروں میں عمیق، رشیدی اور نجیبی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اس زمانہ میں نشر کی طرف بہت کم توجہ کی گئی اور صرف تین تاریخی کتابیں لکھی گئیں لیکن یہ تینوں اپنی جگہ بہت اہمیت

رکھتی ہیں۔ ایک تاریخ عالم سامانی وزیر ابوعلی بلخی کی لکھی ہوئی، دوسری غزنوی بادشاہوں کی تاریخ ابو الفضل بیہقی کی تصنیف کی ہوئی اور تیسری قابوس بن اسکندر کا قابوس نامہ۔

اس کے بعد سلجوقیوں کے زمانہ میں فارسی شاعری کو بڑا عروج حاصل ہوا، لیکن اسی کے ساتھ اسکی سادگی بھی ختم ہوگئی۔ اس عہد کی شاعری عوام کے لئے نہ تھی بلکہ خواص اور اچھے پڑھے لکھے لوگوں کے سمجھنے کی چیز تھی جس سے بغیر شرح و فرہنگ کی مدد کے فائدہ اٹھانا دشوار تھا۔ اس عہد کے شاعروں میں ازرقی، ادیب صابر (جو قصیدہ کا بڑا ماہر سمجھا جاتا تھا) امیر معزی (سلطان سنجر کا بڑا محبوب شاعر) لامعی جرجانی اور عبدالواسع جبلی نے بہت شہرت حاصل کی لیکن انوری کا مرتبہ (جسے قصیدہ کا پیمبر کہا جاتا ہے) سب سے زیادہ بلند تھا۔ سلجوقی عہد میں ان شاعروں کے علاوہ اور بھی چند اکابر شعر و ادب ایسے پیدا ہوئے جن کو زمانہ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، مثلاً سوزنی سمرقندی (جو اپنی ہجو نگاری کے لئے مشہور ہے) نظامی عروضی سمرقندی (مصنف چہار مقالہ) ظہیر فاریابی اور کمال اسماعیل (جسے خلاق المعانی کہتے ہیں)۔

ظہور اسلام کے بعد کے عربی ادب میں رزمیہ شاعری کا کوئی نمونہ اہل ایران کے سامنے موجود نہ تھا، رزمیہ لٹریچر اس لئے کچھ تو انھوں نے جاہلیت کی عربی روایات سے اخذ کیا اور کچھ خود اپنی اپج سے کام لیکر رزمیہ ادب پیدا کیا جس کی بنیاد سامانیوں کے زمانہ سے پہلے اسی وقت پڑ چکی تھی جب ایران پر عربوں کے حملے شروع ہو گئے تھے، لیکن اس زمانہ سے رزمیہ ادب کا نمونہ سوا چند متفرق و منتشر اجزاء کے اور ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ البتہ رودکی کے وقت سے اس نے منظم صورت اختیار کی اور اس سلسلہ میں سب سے پہلے اسنے کلید و دمنہ کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے بعد دقیقی نے خدائے نامہ کو نظم کرنا شروع کیا جو واقعی بڑا کام تھا لیکن پورا نہ ہو سکا۔ لیکن اس عہد کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اسے فردوسی ایسا شاعر نصیب ہوا جس کی رزمیہ مثنوی شاہنامہ نے غیر فانی شہرت حاصل کی۔ فردوسی نے ایک اور مثنوی یوسف و زلیخا بھی لکھی لیکن وہ رزمیہ مثنوی نہیں ہے۔ اس کے بعد اور رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً گرشاسب نامہ، برزونا نامہ، سام نامہ، لیکن شاہنامہ کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا کچھ زمانہ بعد ہی رزمیہ نگاری، رومان نگاری میں تبدیل ہوگئی، چنانچہ عنصری کی مثنوی دامن و عذرا زیادہ تر اسی قبیل کی چیز تھی۔

درباری رزم نگار شاعروں میں نظامی گنجوی بڑے مرتبہ کا شاعر پیدا ہوا، لیکن خالص رزم نگاری میں وہ فردوسی تک نہ پہنچ سکا، ہاں غزل اور رومانیہ مثنوی میں وہ اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔

درباری شاعری اور مدحیہ قصاید نگاری کے ساتھ ہی ساتھ ایرانی لٹریچر میں ایک اور رجحان بھی ابتدا ہی میں پیدا ہو گیا تھا جسے رجحان قصوں کہتے ہیں گو اس کی بنیاد سرزمین عرب میں پڑی تھی لیکن عرب تاجروں کی آمد و رفت کے بعد سے وہ ایران میں بھی عام ہو گیا۔ اس میلان کی ابتدا تحریک "فتوۃ" سے ہوتی ہے۔ فتوۃ سے مراد جوانی میں جذبہ ایشار و قربانی پیدا کرنا تھا اور نعرہ "لافی الا علی" اس کا اصل محرک تھا۔ عرب میں یہ تحریک دراصل امامی و شیعی عقاید سے تعلق رکھتی تھی اور اس کا مقصود "فرایان علی" کی ایک جماعت پیدا کرنا تھا جو مذہب و سیاست دونوں سے ہٹ کر علی کو رومانیہ کا مرکز اسلی قرار دینے کی تبلیغ کرے۔ خلیفہ ناصر الدین احمد کے زمانہ میں اس تحریک نے زیادہ قوت حاصل کی، کیونکہ (حسب بیان فخری) یہ خلیفہ امامی عقاید رکھتا تھا۔ اس کے دربار کے بعض امراء بھی اس جماعت کے رکن بن گئے۔

”فتوۃ“ میں شریک ہونے کے لئے مخصوص مراسم ادا کرنے پڑتے تھے، ان کا خاص لباس تھا جسے ”لباس الفتوۃ“ کہتے تھے اور یہ لوگ خاص قسم کا پاجامہ پہنتے تھے جس کا نام ”سراویل الفتوۃ“ تھا۔ جس وقت کوئی شخص اس جماعت کا ممبر بنایا جاتا تھا تو اسے پیالہ بھر کر ایک خاص قسم کا شربت پلایا جاتا تھا اور اس کا نام ”کاس الفتوۃ“ تھا۔ اس جماعت کے ممبروں کے کئی عہدے تھے، اور سب سے بڑا عہدہ رکھنے والا اس کا مجاز ہوتا تھا کہ ”کاس الفتوۃ“ اور ”سراویل الفتوۃ“ دونوں کے نشانات اپنے بازو پر نقش کر دے۔ خاص خاص مریدوں کو جو خرقہ دیا جاتا تھا اسے خرقہ تصوف کہتے تھے اور اس خرقہ دینے کا اختیار حضرت علی کی نسل سے تعلق رکھنے والے افراد کو حاصل تھا۔ چنانچہ خلیفہ ناصر کے زمانہ میں خرقہ بخشی کا کام نقیب تاج الدین محمد کے سپرد تھا۔ ابن جبر نے شام میں بھی ”ادارہ فتوۃ“ کے پائے جانے کا ذکر کیا ہے اور ابن بطوطہ نے بھی ایشیاء کوچک کی سیاحت کے سلسلہ میں اس جماعت کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ :- ”اس جماعت کے فوجان افراد جن کا اصطلاحی نام فقیان ہے ایک ہی قسم کی تجارت کرتے ہیں اور ایک ہی زاویہ (خانقاہ) میں رہتے ہیں، جس کا ناظم آخری کہلاتا ہے۔ رات کا کھانا ایک ساتھ کھانے کے بعد وہ رقص و سرود میں محو ہو جاتے ہیں۔ ان کے جسم پر ایک لائبی قبا ہوتی تھی اور سر پر ایک سفید ادنی ٹوپی (قلنسوہ) جس میں کپڑے کا ایک گز لائبا ٹکڑا ٹنکا ہوتا تھا۔ ان کے جوتے جنہیں وہ اخفان کہتے ہیں، چرمی موزے کی طرح ہوتے تھے۔ جب میں قونیہ پہنچا تو مجھے بھی اسی قسم کی ایک خانقاہ نیا زاویہ میں قیام کرنے کا موقع ملا اور اس کے ارکان سے گفتگو کر کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ”تحریک فتوۃ“ کو حضرت علی کے وقت کی چیز سمجھتے ہیں۔“

چونکہ ہندوستان میں بھی تصوف کا آغاز عرب و عجم کی طرف سے آنے والے درویشوں اور صوفیہ ہی کے ذریعہ سے ہوا جن میں سے اکثر اس تحریک ”فتوۃ“ سے متاثر تھے اس لئے یہاں بھی خانقاہ، زاویہ، عبادت گاہ، قلنسوہ اور حالی و قال کا رواج ہو گیا۔

ہندوستان کا کوئی صوفی خاندان (چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ) ایسا نہیں ہے جو تصوف یا روحانیت کا مرکز حقیقی حضرت علی کو نہ قرار دیتا ہو اور بات بات میں یا علی اس کی زبان سے نہ نکلتا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستانی صوفیہ کا تعلق ہندوؤں کے کسی فلسفہ سے ہے، صحیح نہیں بلکہ ان کا تعلق اسی تحریک فتوۃ سے ہے جو عرب سے عجم اور عجم سے ہندوستان تک پہنچی۔

اس تحریک کے زیر اثر صوفیہ کو ایک خاص قسم کے لٹریچر کی ضرورت محسوس ہوئی جو ان کے جذبہ روحانیت کو تسکین پہنچانے کے اور اس سلسلہ میں اچھا خاصہ صوفیانہ لٹریچر (قطعات، غزلیات اور رباعیات کی شکل میں) دسویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی میں نشو و نما پا گیا۔ بابا طاہر عربی کا نام اس سلسلہ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے، لیکن انھوں نے اپنے خیالات زیادہ تر نثر میں ظاہر کئے، ان کی رباعیات میں یہ رنگ نہیں ہے، البتہ بابا کوہی شیرازی کا سارا منظوم کلام خالص تصوف کے رنگ کا ہے۔ شیخ ابوسعید کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے صوفیانہ شاعری کی اور بہت سی رباعیاں اس رنگ کی لکھیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں کیونکہ ان سے جتنی رباعیاں منسوب ہیں ان میں ایک دو کے سوا سب الحاقی ہیں۔

صوفیانہ لٹریچر کے عروج کا زمانہ انصاری (پیر برات) سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے نظم تو نہیں، لیکن نظم ہی کی طرح مقفی نثر میں اپنی کتاب ”مناجات“ لکھی۔ ناصر خسرو اور عمر خیام بھی اسی دور کے صوفی شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن خالص صوفیانہ لٹریچر پیش کرنے کا اقدام سب سے پہلے حکیم سنائی نے کیا۔ انھوں نے اپنے دیوان اور مشہور

کتاب حدیقہ کے ذریعہ سے تصوف کو اصطلاحی و علمی حیثیت سے پیش کیا اور امثال و حکایات کی وساطت سے درس اخلاق دیا۔ اس رنگ میں سنائی کے صحیح جانشین فرید الدین عطار تھے جنہوں نے سنائی کے رنگ کو اور زیادہ چمکھا کر دیا، لیکن اس کو انتہائی عروج تک پہنچانے کا سہرا جلال الدین رومی کے سر ہے جن کی ثمنوی دنیائے تصوف میں اس حد تک مقبول ہوئی کہ اسے "زبان پہلوی کا قرآن" سمجھا جانے لگا۔ سعدی شیرازی کا ذکر بھی اس سلسلہ میں کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی تعلیم اصطلاحی تصوف کی نہ تھی بلکہ علمی و اخلاقی تصوف کی۔

نثر فارسی فارسی میں نظم کا حصہ زیادہ وسیع و اہم ہے، نثر کا نہیں۔ بلعنی کا ذکر اس سلسلہ میں پہلے آچکا ہے، لیکن حقیقی معنی میں نثر کے ذریعہ سے لٹریچر کی خدمت کرنے والوں میں سب سے پہلے ابوعلی بن سینا کا نام سامنے آتا ہے، جنہوں نے عربی تصانیف کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی ایک کتاب "دانش نامہ علانی" لکھی جو فلسفہ کی دائرۃ المعارف کہلاتی ہے۔

کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ مرزبان نامہ بھی اس عہد کی بڑی اچھی کتاب تھی جسے مرزبان بن رستم نے طبرستانی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ اصل کتاب تو ایاب تھی، لیکن سعدی و رومی نے فارسی میں ترجمہ کر کے اسے لوگوں تک پہنچایا۔ اس دور کی ایک بہت اہم کتاب نظام الملک کا سیاست نامہ ہے جو اپنے زمانہ کے تاریخی و سیاسی حالات پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔

بارہویں صدی کے اخیر میں عہد اسلام سے قبل کی حکایات شجاعت کا ترجمہ فارسی میں ہونے لگا اور اس نوع کی کتابوں میں کتاب سمک عیار (صدقہ شیرازی کی) بختیار نامہ اور قصۂ حاکم طائی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانہ میں بعض کتابیں تذکرہ کی بھی لکھی گئیں جن میں عوفی کے باب الاہاب کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔

مغلوں کے عہد سے انیسویں صدی تک مغلوں کا ابتدائی عہد ایران میں بڑے انتشار و اضطراب کا دور تھا اس کے بعد بھی کافی زمانہ تباہیوں کی تلافی اور ملک کی اصلاح و تعمیر میں صرف ہوا، اس لئے ظاہر ہے کہ ایسے بے اطمینانی کے دور میں ادب و شعر کی طرف کیا توجہ ہو سکتی تھی، تاہم حیرت کی بات ہے کہ اسی زمانہ میں بعض بڑے بڑے مورخ ایران نے پیدا کئے جن پر مستشرقین مغرب کی تحقیق و جستجو کا انحصار ہے۔ عطاء الملک جوینی، رشید الدین، فضل احمد احمد مستوفی اور قرطبی اسی زمانہ کے مورخ تھے۔

اس زمانہ میں شعراء کم پیدا ہوئے اور جو ہوئے بھی تو انہوں نے تصوف کی طرف زیادہ توجہ کی کیونکہ زوال و ادبار یا پریشانی و بے اطمینانی کی حالت میں تصوف ہی سے کچھ تسکین مل سکتی ہے۔ درباری شاعری کا وجود البتہ ان درباروں میں کہیں کہیں پایا جاتا تھا جو تباہی سے بچ رہے تھے لیکن وہ بھی معمولی درجہ کی تھی بعض شعراء جن میں زیادہ اہمیت تھی انہوں نے اپنا اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا۔ چنانچہ بدر چاچ جو واقعی اچھا قصیدہ گو تھا وسط ایشیاء کو چھوڑ کر ہندوستان آیا اور محمد تغلق کے دربار سے وابستہ ہو گیا، اس کے بعد قانعی طوسی ہندوستان آیا لیکن وہ پھر اپنے وطن واپس چلا گیا غالباً اس لئے کہ یہاں اس کی قدر نہ ہوئی۔

اس دوران میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی کہ ترکی و مغلی زبان کے الفاظ مستعار لے کر فارسی زبان اور انداز بیان میں کچھ جدت پیدا کی جائے چنانچہ پور بہائی جامی کی نظم "زلزلہ نیشاپور" اسی قبیل کی چیز تھی۔ لیکن صوفی شعراء کا رنگ وہی رہا اور اس سلسلہ میں عراقی کے لمحات اور عشاق نامہ، اوصد الدین کرمانی کی مصباح الارواح، اوصد کی جام جم، محمود شبستری کی گلشن زار خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس زمانہ میں صوفیاء رباعیاں لکھنے والے بھی

پیدا ہوئے جن میں افضل الدین کاشانی نے کافی شہرت حاصل کی۔ (انھوں نے چند رسالے فلسفہ و حکمت پر بھی لکھے) لیکن نزاری کو ہستانی نے جو کچھ لکھا وہ بالکل نئی قسم کی چیز تھی یعنی اس نے ظاہری شعائر اسلام کے خلاف نہایت سختی سے اظہار خیال کیا اور اسے مرتد و ملحد قرار دیدیا گیا۔

الغرض فارسی شاعری و ادب میں مغلوں کے ابتدائی عہد تک نہ صرف یہ کہ کوئی ترقی نہیں ہوئی، بلکہ اس میں انحطاط ہوتا رہا۔ اس کے بعد تیمور اور آل تیمور کے زمانہ میں پھر اس میں از سر نو جان پڑی۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ مغل بلوکیٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہت سے خود مختار خاندانوں میں منتقل ہو گئی، جو دربار کی تمام قدیم روایتوں کو زندہ رکھنا چاہتے تھے جس میں شاعروں کی قدر دانی بھی شامل تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کا دوسرا کلاسیکل دور شروع ہو گیا ہر چند اس عہد کی شاعری میں وہ بات تو پیدا نہیں ہوئی جو مغلوں سے پہلے دربار میں پائی جاتی تھی تاہم بعض ایسے شاعر بھی اس زمانہ میں ابھرے جو اپنے اسلاف سے بازی لے گئے۔ مثلاً ابن یمن (سہزادہ کے دربار کا شاعر) جو قطعات کا بادشاہ تھا یا خواجہ کرمانی جس نے نظامی کے متبع میں بہت لطیف ثنویاں لکھیں اور غزل گوئی میں سعدی کا رنگ پیدا کیا۔ مشہور طنز نگار شاعر عبید زاکانی۔ اور سلمان ساوجی سنایح و بدایح کا ماہر یہ دونوں بھی اسی عہد

کے شاعر تھے، لیکن ایک اور شاعر حافظ شیرازی ایسا پیدا ہوا جس نے غزل گوئی میں اپنا سکہ ساری دنیا پر بٹھا دیا اور اپنے فن کے لحاظ سے یہ اتنی بڑی شخصیت کا مالک تھا کہ اگر اس عہد میں حافظ کے سوا کوئی اور شاعر سیرا نہ ہوتا تو بھی کافی تھا۔ ان شاعروں سے نسبتاً کم درجہ کے شاعر ابوالسحاق اور قاری یزدی بھی تھے۔ ابوالسحاق کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا کوئی شعر کمانے کے ذکر سے خالی نہ ہوتا تھا، ان مدثر الذکر شعرا کا کلام دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ شاعری میں پھر انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ نثر نگاروں میں صرف ضیاء الدین نخشی ذکر کے قابل ہے اس نے سند باد نامہ کا ترجمہ طوطی نامہ کے نام سے پیش کیا اور ایک مختصر سا رومان گلرہ کے نام سے لکھا۔ اس عہد میں شاعری کے انحطاط کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مسمیٰ کے لکھنے کا رواج اسی زمانہ میں پیدا ہوا۔ شعر و ادب میں تصوف کا رنگ اس عہد میں بھی پایا جاتا تھا، چنانچہ شیخ نعمت اللہ کرمانی نے (جنہیں شیخ نعمت اللہ ولی بھی کہتے تھے اور جن کے نام سے تصوف کا ایک خانوادہ ہی علیحدہ قائم ہو گیا تھا) ۵۰۰ کے قریب چھوٹے چھوٹے رسالے تصوف میں لکھے اور ایک دیوان بھی اپنے بعد چھوڑا۔ قاسم انور بھی اسی عہد کا شاعر تھا جس نے اپنے کلام میں ترکی اور گیلانی الفاظ کا استعمال کیا۔

اس عہد کے دوسرے شعراء میں کاتبی نیشاپوری (جس نے زیادہ تر قصے لکھے) اور عارفی ہراتی (جو اپنی کتاب گوئی و چوگاں کی وجہ سے بہت مشہور ہے) عصمت بخاری (جن کا صوفیانہ رسالہ ادہم نامہ بہت مقبول ہوا) اسی زمانہ میں پیدا ہوئے۔

ملاحسین واعظ کاشفی بھی اسی عہد کا شاعر تھا جس نے کلید و دمنہ کا ترجمہ انوار سہیلی کے نام سے پیش کیا لیکن سب سے زیادہ شہرت ملا عبدالرحمان جامی کو حاصل ہوئی جنھوں نے متعدد رسائل نثر کے علاوہ اپنے بعد سات مثنویاں چھوڑیں اور ایک بہت بڑا دیوان۔ ان کی مثنویوں میں یوسف زلیخا اور لیلیٰ و مجنون بہت زیادہ مشہور ہوئیں۔ لیکن باد صفت اس شہرت و کمال کے جس حد تک شاعرانہ خوبیوں کا تعلق ہے وہ کلاسیکل شاعری کو نہ پہنچ سکے۔

اس عہد میں بعض مورخ بھی پیدا ہوئے جن میں حافظ آبرو، عبدالرزاق سمرقندی، میرخوند اور خوند میر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اب ہم اس زمانہ میں پہنچ گئے ہیں، جب ایک طرف ایران میں صفوی حکومت برسر عروج ہے اور دوسری طرف ہندوستان میں مغلوں کا دور دورہ ہے اور ان دونوں حکومتوں میں ایک طرح کی رقابت بھی پائی جاتی ہے لیکن اس رقابت کا تعلق ملک گیری سے نہیں، بلکہ نام و نمود سے تھا۔ دونوں سلطنتیں اپنے آپ کو علم و فضل کا مرکز بنانا چاہتی تھیں اور دونوں جنگ اہل کمال کی قدر کی باقی تھی۔ لیکن فرق یہ ہے کہ صفوی خاندان خالص شیعہ مذہبی حکومت قائم کرنے کا متمنی تھا اور ہندوستان کے مغل فرمانروا زیادہ آزاد خیال تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایران کی شاعری کا رجحان بھی مذہبیت کی طرف ہو گیا اور اس میں بجائے ترقی کے انحطاط ہونے لگا، کیونکہ کر بلا اور شہداء کر بلا کے ذکر میں کسی شاعرانہ اپج یا خیال آرائی کی گنجائش نہ تھی اور اسی لئے صفوی عہد کی شاعری محض گریہ و بکا، ماتم و شہیون کی شاعرانہ رہ گئی اور اس میں بھی ایک محترم کاشی کے علاوہ (جو اپنے ہفت بند کی وجہ سے بہت مشہور ہے) اور کوئی قابل ذکر شاعر پیدا نہ ہوا۔ البتہ اس دور میں فقہی و مذہبی قسم کا لٹریچر ضرور پیدا ہوا جس میں نسبتاً زیادہ سلاست پائی جاتی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ موجودہ ایرانی لٹریچر کا سنگ بنیاد عہد صفوی ہی کا ادب تھا۔

یونہی عہد صفوی کے شاعروں کی فہرست بھی کافی طویل ہے اور اس میں ہاتھی، بابا قنانی، امیدی، اہلی شیرازی، اہلی ترشیزی، لسانی، وحشی وغیرہ کے نام ہم کو نظر آتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی شاعر بھی ایسا نہیں تھا جس کا نام زندہ رہا ہو۔ یا جس کے کلام کی طرف محققین ادب نے توجہ کی ہو۔ وحشی کی تثنوی فریاد و شہریں البتہ ایک حد تک پسند کی گئی اور اہلی شیرازی کا نام بھی کچھ عرصہ تک لوگوں کی زبان پر رہا، لیکن اس کے بعد عہد صفوی کے تمام شعراء کو دنیا نے سبلا دیا کیونکہ انھوں نے زندہ شاعری کی کوئی مثال اپنے بعد نہ چھوڑی تھی۔

پھر اسے عہد صفوی کی زمانہ ناشناسی کہئے یا ہندوستان کے مغل دربار کی غیر معمولی قدر دانی سولہویں اور سترھویں صدی میں ایران کے تمام اچھے اچھے شاعر ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچنے لگے اور مغل دربار فضل و کمال کا مرکز بن گیا اور فارسی شاعری ایک بالکل نئے دور میں داخل ہوئی جس میں ایران و ہندوستان دونوں جنگ کے کلچر کی جھلک ہم کو ملتی ہے۔

ہندوستان آنے والے ایرانی نژاد شعراء کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن ان میں عربی، نظیری، سیابی، طالع آملی، ابوطالب کلیم اور زامانی بڑے مرتبہ کے شاعر تھے۔

اٹھارہویں صدی کے اخیر میں جب ایران کا صفوی عہد ختم ہوا اور قاچاری دور شروع ہوا تو پھر وہاں فارسی ادب میں آثار حیات پیدا ہونے لگے، ہر چند یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی اثرات ایران میں زیادہ وسیع ہو گئے تھے اور مغربی ادب سے بھی یہاں کے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ لیکن فتح علی شاہ کا دربار قدیم رنگ کا دربار تھا جس میں کلاسیکل قسم کی درباری شاعری ہی کو مقبول ہو جانا پڑا تھا۔ اس زمانہ میں نشاط اچھا غزلگو پیدا ہوا اور سبباً نے فردوسی کے تتبع میں شہنشاہ نامہ کے نام سے ایک تثنوی لکھی جس میں روسیوں کے ساتھ عباس مرزا کی جنگ کا حال نظم کیا گیا ہے۔ وصال بھی اسی عہد کا ایک اچھا شاعر تھا لیکن ان میں سے کسی کے کلام میں ہم حدت و ابداع کا نشان نہیں ملتا۔ قاضی، شیبانی اور یغہ البتہ اس عہد کے بڑے قابل قدر شاعر تھے۔ قاضی انگریزی اور فرانسیسی بھی جانتا تھا اور ان زبانوں کی کئی کتابوں کا ترجمہ بھی اس نے کیا اور اس کی قدر بھی ہوئی لیکن شیبانی اور یغہ دونوں قاچاری حکومت کی بے اعتنائی کا شکار رہے اور ان دونوں کی عمر اسی شکایت میں بسر ہوئی۔ یغہ کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ سب سے پہلے اسی نے فارسی زبان سے غیر ملکی لغات

دور کرنے کی کوشش کی، اس کے بعد جب مغربی علماء کی نگرانی میں یہاں ”دارالفنون“ قائم ہوا تو یہ تحریک اور زیادہ قوی ہو گئی۔

دارالفنون کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ غیر زبانوں کی اچھی اچھی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا جائے اور چونکہ یہ کام کلاسیکل فارسی سے نہ چل سکتا تھا اس لئے قدیم اسلوب بیان میں تبدیلی پیدا کی گئی اور اس طرح فارسی کے ادب جدید کا آغاز ہوا۔ دارالفنون کا پہلا ناظم رضاقلی خاں ہدایت تھا۔ یہ ادبیات ایران کا بڑا اچھا مورخ تھا۔ جسکی کتاب مجمع التہذیب بہت مقبول ہوئی۔ اس کے شاگردوں میں صنیع الدولہ (احشام السلطنت) بھی ایران جدید کی تاریخ کا بڑا ماہر تھا اور جس کی تصانیف سے مغربی مورخ نے بہت فائدہ اٹھایا۔

اسی زمانہ میں مرزا عبدالرحمان سنجار زادہ بھی پیدا ہوا جس نے مختلف موضوع پر متعدد کتابیں فارسی میں تصنیف کیں جن میں مسالک المحسنین بہت پسند کی گئی۔

اس کے بعد جب انیسویں صدی کے آغاز میں یہاں سب سے پہلی مرتبہ پریس قائم ہوا تو جہزید کی اشاعت بھی ممکن ہو سکی۔ لیکن اول اول یہ صرف دربار کے لئے مخصوص تھے۔ بعد کو ۱۸۵۷ء میں سب سے پہلا عوامی اخبار شایع ہوا۔ اور یہ آغاز تھا ایران جدید کے ادب جدید کا جس نے انقلاب ایران اور قیام مشروطہ میں بڑی مدد کی۔

یہ زمانہ ایران کی سیاسی بیداری کا تھا اور آزادی کی عام لہر ملک میں دوڑ گئی تھی، اس لئے اب ملک کے ذہنی مطالبات بھی بہت کچھ بدل گئے تھے اور اسی ادب کی مانگ بڑھ رہی تھی جو عوام کے سیاسی جذبات کا ساتھ دے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے آغاز میں یہاں کے ادب میں بھی بڑا زبردست انقلاب پیدا ہوا اور تمام کلاسیکل ادب کی جگہ ادب جدید نے لیلی، جس کا اسلوب دل و دلہہ بالکل نیا تھا اور جس کی زبان بھی فردوسی و خاقانی کی نہیں بلکہ گلیوں میں چلتے پھرتے عوام کی زبان تھی۔ چونکہ رجعت پسندی یا قدامت پرستی آسانی سے جگہ نہیں چھوڑتی اسی لئے انقلابی لٹریچر کا لب و لہجہ ہمیشہ تلخ و پر جوش ہوا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں ایران جدید نے جو ادب پیش کیا، اس میں بھی بڑی آتش بیانی اور طنز و استہزاء کی تلخی ملتی ہے۔ علی اکبر وہ خدا نے انقلابی اخبار صور اسرافیل میں عوام کے جذبات ابھارنے کے لئے جو کچھ لکھا وہ اس نوع کے ادب کی بڑی اچھی مثال ہے اور اس سلسلہ میں ملک الشعراء بہار کے وہ قصائد جو بالکل سیاسی تبلیغ کی حیثیت رکھتے ہیں اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ابوالقاسم عارف قزوینی بھی اسی عہد کا مشہور ادیب تھا جس نے انقلاب ایران میں نمایاں حصہ لیا۔ ایرج مرزا نے انقلاب کے ایک خاص پہلو کو سامنے رکھا اور وہ ایرانی عورت کی آزادی کا مسئلہ تھا۔ نوجوان شاعروں میں رشید یاسمی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اپنی غزلوں میں مغربی خیالات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایک ادبی تاریخ بھی تصنیف کی۔ نیمہ ایران کے مزدوروں کا شاعر ہے اور اس کی شاعری کی ٹانگ بالکل نئی ہے جس کا علم اس کی نظم محبس کے دیکھنے سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں نظام وفا کا ذکر بھی ضروری ہے جس نے دو حدود درجہ جذبات انگیز مثنویاں لکھیں۔ ایک اور ادیب وحید دستگردی بھی قابل ذکر ہے۔ یہ رسالہ ارمغان کا ادیب تھا اور ایک خاص انداز تحریر کا مالک تھا۔ ایک خاتون پروین بھی ادیب کی حیثیت سے اسی زمانہ میں پیدا ہوئی جس کی تحریر بہت سلیس و سادہ ہوتی تھی۔

ادب ایران کے انقلابی رجحان کا عروج ہمیں مرزا عشقی کے یہاں ملتا ہے جس کی نظم پیر مرد دہقان نے بڑی شہرت حاصل کی۔ ایک اور انقلابی ادیب قاسم لاہوتی بھی اسی زمانہ کی پیداوار ہے جس نے اپنی انقلابی نظموں میں قدیم ٹانگ

سے بالکل کام نہیں لیا۔ عشقی تو ۱۹۲۵ء میں مار ڈالا گیا لیکن لامہوتی روس چلا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایران میں نثر نگاری کی طرف زیادہ میلان ہو گیا اور ناول، افسانے، ڈرامے زیادہ لکھے گئے۔ سلسلہ میں سب سے پہلا تاریخی ناول ”عشق سلطنت“ شیخ موسیٰ ہمدانی نے لکھا۔ اس کے بعد آغا مرزا حسن خاں بدیع نے بہن و منیزہ کا قصہ شاہنامہ سے لیکر ناول کی صورت میں پیش کیا اور صنعتی زادہ کرمانی نے مانی کی زندگی پر ایک ناول لکھا۔ ان تمام تاریخی ناولوں میں محمد باقر مرزا خسروی کا شمس الطغرا (تین حصوں میں) بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں اس نے دکھایا ہے کہ مغلوں کی حکومت کے زمانہ میں فارسی کا کیا حال تھا۔ کمائی کا لکھا ہوا ناول لازیکا بھی خوب ہے۔ عباس خلیلی نے اپنے ناول ”روزگار سیاہ“ میں موجودہ ایران کی عورت اور اس کی مشکلات کو پیش کیا اور اس کے علاوہ جند اور چھوٹے چھوٹے ناول (انتقام۔ انسان اور آثار شب) لکھے۔ مصطفیٰ مشفق کاظمی نے اپنی کتاب طہران مخوف میں بتایا ہے کہ ۱۹۲۱ء سے قبل ایرانی حکومت کیسی مجرمانہ ذہنیت رکھتی تھی۔ احمد علی خاں خدا دادہ نے اپنے ناول ”روزگار سیاہ کارگر“ ایران کے طبقہ کاشتکار کی تباہ حالی کو پیش کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد بھی ایرانی ادیبوں کی ذہنیت بدستور انقلاب پسندانہ رہی اور اب اس میں حالات کے لحاظ سے اور زیادہ تشدد پیدا ہونے کا امکان ہے کیونکہ ایران اب ایک اور انقلاب کا منظر ہے اور یہ انقلاب خالص اشتراکی ہوگا جس کا ساتھ دہاں کے شعرو ادب کو بھی دینا ہے۔

عورت اور تعلیمات اسلام

از مالک رام ایم۔ اے

نادائق لوگوں کی طرف سے اسلام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے عورت کی اصلاح اور اسکے حقوق کی حفاظت کا خیال نہیں کیا اور اس کو لونڈی کی حیثیت سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ مالک رام صاحب نے اس تصنیف میں بتایا ہے کہ گہوارہ سے لیکر محد تک عورت کی اور اس کی زندگی کی اصلاح کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو اسلام نے ترک کر دیا ہو اور اس کا اقتدار قائم کرنے کی انتہائی تاکید نہ کی ہو۔ اس کتاب میں عورت سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس سے بحث نہ کی گئی ہو اور اس التزام کے ساتھ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف قرآن پاک ہی کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے۔ کتاب نہایت نفس کاغذ پر پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منگلار ہیک ایجنسی لکھنؤ

کیا اس کتاب کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں
اگر نہیں۔ تو پہلی فرصت میں اسے طلب فرمائیے

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اس کو ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد اس وقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک اسے ختم نہ کر لیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ:-

زندہ رہنا بھی ایک فن ہے

اور اگر اس فن کو آپ نے سمجھ لیا تو پھر

- ۱۔ دنیا کا ہر رنج و الم آپ کے لئے بے معنی ہو جائے گا۔
- ۲۔ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ حیات نو کا آغاز ہوگا۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے علاوہ محصول

منگلار لکھنؤ

مذہب عالم کی تخلیق اور قطب شمالی

پیدائش عالم

(بہ سلسلہ ماہ ستمبر ۱۹۵۲ء)

مذہب عالم کے تکوینی نظریوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ”شروع میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور بعد کو پانی سے زمین نمودار ہوئی“ اب سوال یہ ہے کہ ہر طرف پانی ہی پانی کیوں تھا اور زمین پانی کے نیچے کیسے پہونچ گئی۔ میرے خیال میں اس کا تعلق ”طوفان نوح“ کے واقعہ سے ہے یعنی پانی جسے شروع میں موجود مانا جاتا ہے یہ وہ پانی ہے جس میں ساری زمین ڈوب گئی تھی اور زمین جسے تکوینی نظریوں میں پانی کے نیچے موجود مانا جاتا ہے یہ وہ زمین ہے جو غرقاب تھی اور اس غرقاب زمین کے دوبارہ نمودار ہونے کا نام پیدائش زمین یا پیدائش عالم تھا۔ میں اس نتیجہ پر وسط ہند کی مذہبی روایتوں اور امریکی ہندویوں کی روایتوں کے تقابلی مطالعہ سے پہونچا ہوں کیونکہ دونوں میں ”پیدائش عالم“ اور ”طوفان نوح“ کے واقعات آپس میں مل جلتے نظر آتے ہیں۔

جاپانی روایت میں آپ نے دیکھا کہ زمین کو ایک دیوتا سمندر متھ کر باہر نکالتا ہے (سمندر متھنے سے مراد وہ ہیجان ہے جو طبقات الارضی اسباب کی بناء پر قطبی جزیرے کے نمودار ہوتے وقت بھر آرٹکٹک میں پیدا ہوا تھا) اور نیوزیلینڈ کی روایت بھی یہی ہے کہ زمین کو جو پانی میں ڈوبی ہوئی تھی ایک دیوتا اپنے کھپلی پکڑنے والے کانٹے میں پھنسا کر سطح آب پر لاتا ہے ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدائش زمین کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زمین پانی کے اندر موجود رہتی ہے اور اسے کوئی انسان شکل کا دیوتا باہر لاتا ہے۔

دوسرے نظریے کے مطابق زمین کو پانی سے باہر نکالنے والے کا تصور ایک پرند کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ عموماً اس پرند سے مراد آفتاب ہوتا ہے۔ آفتاب کو پرند سے استعارہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ مشرق سے مغرب کی طرف فضا کو طے کرتا ہے تو اسے ایک آہستہ آہستہ اڑنے والے پرند سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اور اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ کبھی انسان قطب شمالی پر رہتا تھا تو وہاں کے رہنے والوں کو تو آفتاب اور زیادہ پرند سے مشابہ نظر آتا ہوگا کیونکہ وہاں چھ مہینے کا دن ہوتا ہے اور اس عرصے میں آفتاب برابر فضا میں گول چکر کاٹتا رہتا ہے۔ اس کا ہر چکر چوبیس گھنٹوں میں پورا ہوتا ہے (اس عرصہ میں زمین اپنے محور پر ایک بار گھوم جاتی ہے) اس طرح وہ آسمان پر منڈلاتے ہوئے عقاب کے مانند ہوتا ہے چنانچہ پرانے زمانہ میں عقاب یا عقاب زمین کو آفتاب کی علامت مانا جاتا تھا (اور کسی قدر اب بھی) بعد میں عقاب کی جگہ دوسرے پرندوں نے لی۔

ان تمہیدی الفاظ کے بعد ہم ان تکوینی کہانیوں کو پیش کریں گے جن میں آفتاب کو آفریدگار کی حیثیت سے پرند کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایٹھاپسین لوگوں کی روایت

ایٹھاپسین لوگوں کے عقیدہ کے مطابق جن کے قبیلے خلیج فارس سے لیکر بحر ہند تک (شمالی امریکہ میں) پھیلے ہوئے ہیں اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک گودہ پیکر کو آتھا جس کے پردوں کی پھڑپھڑاہٹ بادل کی گرج تھی اور جس کی اُچھٹی ہوئی نظر بجلی کی چمک اور جب وہ سمندر پر اُترا تو زمین فوراً باہر آگئی اور پانی کی سطح پر قائم ہوگئی۔ ایک دوسری روایت ہے کہ اُس نے حکم دیا اور زمین پانی سے نمودار ہوگئی۔ یہاں پر جس پرند کو آفریدگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے یقیناً آفتاب ہے۔ آفتاب کے نور و نار نے اُس کا تعلق بجلی کی چمک اور اُس کی کڑک سے پیدا کر دیا۔ یہاں پر بھی زمین پانی میں ڈوبی رہتی ہے جو اُس پرند کو دیکھ کر یا اُس کے حکم سے باہر آجاتی ہے۔

مسک ہوگی لوگوں کی روایت

مسک ہوگی لوگوں کے عقاید کے مطابق جو شمالی امریکہ کے دریائے مسسپی کے مشرق میں آباد ہیں۔ تخلیق عالم سے پہلے ہر طرف ایک بھر ذخار نظر آتا تھا اور اُس پر دو کبوتر ادھر سے ادھر اڑتے پھرتے تھے۔ بالآخر اُنھوں نے پانی کی سطح سے ایک گھاس کی پتی کو سر بلند ہوتے ہوئے دیکھا اور دھیرے دھیرے خشک زمین باہر آگئی اور ہر عظیم اور جزیرے موجودہ شکل میں نمودار ہو گئے۔ یہاں پر جن کبوتروں کو پانی پر اڑتا ہوا مانا گیا ہے اُن کا مقابلہ یہودیوں کی کتاب پیدائش کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ ”اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی“ (باب ۱- آیت ۲) اور انجیل میں بعض مقامات پر خدا کی روح کا کبوتر کے مانند یسوع پر اترنے کا ذکر ہے (ہیپتسمہ کے سلسلہ میں)۔ میرے خیال میں ان آیتوں میں خدا کی روح سے مراد آفتاب ہے جسے زمانہ قدیم میں پرندہ سے استعارہ کرتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ مسک ہوگی روایت میں دو کبوتروں سے کیا مراد ہے۔ میرے خیال میں ان سے سورج چاند مراد ہے۔

اس روایت پر کس قدر وسط ہند کی روایتوں سے روشنی پڑتی ہے۔ بھوٹیا لوگوں کے عقیدہ کے مطابق جو چھوٹا ناگپور۔ اڑیسہ اور بنگال میں آباد ہیں شروع میں صرف خدا یا دھرم کا وجود تھا جس کے ظاہری نمائندے سورج اور چاند تھے۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھائے ہوئے آدمی کی سات گنا اونچائی کے برابر سمندر نمودار ہوا۔ مڑا لوگوں کی روایت ہے کہ شروع زمانہ میں زمین پانی سے ڈھنکی ہوئی تھی اور سنگ بونگا یعنی سورج دیوتا اُسے سیتا تھا۔ گونڈ لوگوں کے مطابق سمندر کے بیچ میں سنگھائی چڑیوں کا جوڑا رہتا تھا۔ اُنھوں نے پانی کے اوپر اپنا گھونسلا بنایا اور اُس میں دو انڈے دئے (ہوناٹا سورج چاند تھے)

مسک ہوگی لوگوں کی روایت میں جس گھاس کی پتی کو پانی سے نمودار ہوتے دیکھا گیا تھا اُس کا مقابلہ جاپانیوں کے نرکل اور ہندوؤں کے دشنوجی کی نان سے اگنے والے کنول سے کیا جاسکتا ہے اور میرے خیال میں ان سے مراد وہ دھوا ہے جو قطبی جزیرے کے نمودار ہونے سے پہلے بحر آرکٹک سے ایک باریک خط کی صورت میں اُٹھتے ہوئے دیکھا گیا ہوگا۔ آئیسو، جاپان کے قدیم باشندے ہیں جو وہاں کی منگول آبادی سے بالکل مختلف ہیں۔ اُن کی روایات کے مطابق شروع میں یہ دنیا محض دلدل تھی جس میں مٹی اور پانی بری طرح آپس میں ملے ہوئے تھے۔

اس مٹی میں کسی چیز کا وجود نہ تھا کیونکہ وہ حیوانی زندگی کی بقا کے لئے بالکل باقابل تھا اور نہ فضا کے ہوائی

میں کسی قسم کے پرند تھے۔ سب کچھ سنان، ویران اور غیر آباد تھا۔

بہر حال ہادلوں میں نیچے درجے کے دیوتا تھے اور عرشِ معلیٰ پر خالقِ عالم فرشتوں کے ہجوم میں رہتا تھا۔ آخر کار خدا نے برقی زمین کو آباد کرنے کا تہیہ کر لیا اور اُس نے مموئے کے قسم کی ایک چڑیا بنائی جس کی دم ہر وقت ہلتی رہتی تھی اور اُسے آسمان سے زمین کو پیدا کرنے کے لئے بھیجا اور جب چڑیا نے دنیا کو مذکورہ دشتناک حالت میں مبتلا دیکھا تو اُس کا سر ہلکا گیا کہ وہ اپنے کارِ معینہ کو کس طرح انجام دے۔ اُس نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور کیچڑ والے پانی کو اپنے پروں سے روندنا اور اُس پر اپنی دم کو مارا اور پھر ایک عرصہ کے بعد خشک حصے نمودار ہونا شروع ہو گئے اور پانی تدریجاً سمندر بن گیا اور اس طرح زمین اپنے وقت پر پانیوں سے برآمد ہوئی اور اُسے پانی پر تیرنے کے لئے مجبور کیا گیا۔ اسی لئے آئینہ زمین کو موثری یعنی "تیرنے والی آراضی" کہتے ہیں اور مموئے کی بڑی عزت کرتے ہیں۔

یہاں پر مموئے سے مراد آفتاب ہے اور زمین جسے پانی سے برآمد کیا گیا تھا یقیناً کوئی جزیرہ تھی (ہمارے خیال میں قطبی جزیرہ) کیونکہ اُسے "تیرنے والی آراضی" کہتے ہیں اور پُرانے زمانہ میں یہ عام عقیدہ تھا کہ جزیرے تیرتے ہیں۔

فلیپائن کی روایت فلیپائن کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ شروع میں کائنات آسمان پانی اور ایک شکرے پر مشتمل تھی جو اُن کے درمیان اڑتا پھرتا تھا اور جب وہ اڑتے اڑتے تھک گیا اور اُسے بیٹھنے کے لئے کوئی جگہ نہ ملی تو اُس نے آسمان اور پانی میں تفرقہ ڈال دیا۔ آسمان نے پانی کو حد میں رکھنے کے لئے اور اس خیال سے کہ وہ بہت نہ بڑھ جائے جزیروں سے لاد دیا جن میں وہ شکرارہ سکے اور انھیں امن و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دئے۔

ایک دن شکرارہ ساحل پر کھڑا ہوا تھا کہ اُس کے پنجوں سے ایک بید آکر ٹکرایا جو نہ معلوم کب سے اُس سمندر میں تیر رہا تھا۔ اُس بید میں دو جوڑے تھے اور جب اُس نے ایک جوڑہ کھولا تو اُس میں سے ایک مرد نکلا اور جب دوسرے جوڑے کو کھولا تو ایک عورت نکلی جن کی ہاتھو میکا پل دیوتا کی اجازت سے فوراً شادی کر دی گئی اور دنیا کی ساری قومیں انھیں سے پیدا ہوئیں۔

یہاں پر جس شکرے کو آفریدگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا یقیناً آفتاب ہے۔ آسمان اور پانی کا اختلاف اور پانی کا بڑھنا اُس تلاطم کی طرف اشارہ کرتا ہے جو قطبی جزیرے کی نمود کے وقت بحرِ آرکٹک میں پیدا ہوا ہوگا۔

پانی پر تیرنے والے بید کا مقابلہ جاپانیوں کے نرکل اور وشنو جی کی ٹان سے اُگنے والے کنول سے کیا جاسکتا ہے اور میرے خیال میں ان سے مراد وہ دھواں ہے جو قطبی جزیرے کے نمودار ہونے سے پہلے بحرِ آرکٹک کے وسط میں ایک باریک خط کی صورت میں بلند ہوتے ہوئے دیکھا گیا ہوگا۔ لیکن ادھر غور کرتے ہوئے میں ایک دوسرے نتیجے پر بھی پہنچتا ہوں یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ جس نرکل یا بید سے مرد اور عورت کا پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے اور جو پانی پر تیرتا پھرتا تھا وہ حضرت نوح کی کشتی کی ایک صورت ہو۔ ایک زبردست طوفان آیا جس میں ساری دنیا ڈوب گئی صرف ایک انسانی جوڑا بچا جس نے کسی درخت کے کھوکھلے تنے میں (کشتی کی ابتدائی صورت) بیٹھ کر اپنی جان بچائی۔ اسے درخت یا اُس کے تنے کو بعض اقوام نے بید یا نرکل بتایا ہے جس سے پہلا انسانی جوڑا پیدا ہوتا ہے۔ اس خیال کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بعض اقوام میں اولین انسانی جوڑے کا ایک درخت پیدا ہونا ظاہر کیا جاتا ہے اور ہمارے خیال میں یہ درخت طوفانِ نوح کی کشتی کی ایک صورت ہے یعنی درخت سے پورا درخت نہیں مراد ہے بلکہ کسی درخت کا کھوکھلا تنہ اور اولین انسانی جوڑے سے آدم اور حوا مراد نہیں ہیں بلکہ وہ مرد اور عورت جو عالمگیر طوفان سے بچ گئے تھے۔

اس کے بعد ہم وہ ٹکوتنی نظریہ پیش کریں گے جس کے مطابق زمین کو کوئی دیوتا جانور کی صورت میں باہر نکالتا ہے یا بعض جانور کسی دیوتا کے حکم سے اُسے باہر نکالتے ہیں۔ عموماً یہ جانور پانی اور خشکی دونوں پر رہنے والے ہوتے ہیں (جبل بھومی) کہ ان کا تعلق اُس مذہب سے ہوتا ہے جسے ٹوٹم ازم کہتے ہیں (اس مذہب کو ماننے والے بعض جانوروں کو مقدس مانتے ہیں اور اُنہیں اپنا مورث اعلیٰ بتاتے ہیں) اور کبھی ستاروں کے مختلف مجموعوں سے۔ پُرانے زمانہ کے انسان نے ستاروں بہت سے مجموعوں کو جانوروں سے استعارہ کیا تھا۔ ان میں سے دو کا جاننا ہمارے لئے بہت ضروری ہے ایک تو دُبِ اکبر (چھوٹا بھالو) اور دوسرا دُبِ اکبر (بڑا بھالو) کیونکہ یہ دونوں قطب شمالی پر رہنے والوں کو سمت المراس میں نظر آ رہے ہوں گے۔ اب اگر ہمارا یہ دعوے صحیح ہے کہ طوفانِ نوح اور پیدائشِ عالم کا تعلق قطب شمالی سے ہے تو ہمیں ان واقعات میں دُبِ اصغر اور دُبِ اکبر کی طرف اشارہ ملنا چاہئے چنانچہ ہندوؤں میں دُبِ اکبر کو ”سپت رشی“ کہتے ہیں اور اُنکی روایت کے مطابق وہ منوجی کے طوفان میں سپت رشی اُن کی کشتی میں سوار تھے۔ اور امریکن ہندیوں کی روایات میں (خاص کر وہ کہانیاں جو کیلیفورنیا کے اطراف میں آباد امریکن ہندی بیان کرتے ہیں) ایک بھیرٹے (کویوٹ) کو آفریڈگاہ کی حیثیت سے چنا گیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں اس بھیرٹے سے مراد دُبِ اصغر ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ جس طرح بعض اقوام نے ستاروں کے اس مجموعہ کا تصور بھالو کی صورت میں کیا تھا۔ ان لوگوں نے بھیرٹے کی صورت میں کیا ہو۔ اب ہم اس نظریے کی وضاحت کے لئے امریکن ہندیوں کی روایات پیش کرتے ہیں۔

کروک یا اپ ریور ہندیوں کی روایت
 کروک یا اپ ریور ہندیوں کے عقیدہ کے مطابق جو کیلیفورنیا آباد ہیں اس دنیا کو ایک بھیرٹے اور ایک عقاب نے پیدا کیا۔ شروع میں تاریکی اور خاموشی تھی اور ہر طرف پانی تھا۔ بھیرٹا اور عقاب آسمان پر رہتے تھے۔ بھیرٹا آسمان کی دُستیا اُگتا گیا۔ آخر اُس نے آسمان میں ایک سوراخ کیا اور نیچے جھانکا۔ نیچے پانی ہی پانی تھا وہ نیچے اُترا اور اُس نے ایک چھوٹا جزیرہ بنایا جسے وہ نیچے مار مار کر عدم سے وجود میں لایا تھا اور تب وہ اُس پر بیٹھ گیا۔ جب بھیرٹے نے آسمان میں چھید کیا تو عقاب کہیں گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اُس نے بھیرٹے کو پکارا گا وہ نہ ملا۔ بالآخر اُسے آسمان کا چھید نظر آیا اور اُس نے نیچے جھانکا۔ دیکھا کہ بھیرٹا ایک چھوٹے سے جزیرے پر بیٹھا ہے ہے جو اُس نے بنایا تھا۔ عقاب نے کہا ”میں نیچے جاؤں گا اور معلوم کروں گا کہ بھیرٹا کیا کر رہا ہے“ پس عقاب اُڑ گیا اور بھیرٹے کے ساتھ اُس جزیرے پر بیٹھ گیا لیکن وہ بہت چھوٹا تھا اور اُس پر دونوں کے لئے جگہ نہ تھی۔ اس نے عقاب نے ایک دوسرا جزیرہ بنایا جب عقاب اپنے کام میں لگا ہوا تھا تو اُس کے کچھ پر گر پڑے اور اُنہوں نے زمین میں جڑ پکڑ لی اور بڑھ کر درخت بن گئے اور پہاڑ کے ڈھلوان حصوں کو ڈھانپ لیا۔ اُس کے کچے پر جن کی پوری طور پر نشوونما نہ ہوئی تھی جھاڑیاں اور پودے بن گئے۔

عقاب نے جس پہاڑ کو بنایا تھا وہ دنیا کا پہلا پہاڑ تھا اور کروک ہندی دریائے کلا ماتھ کے قریب ایک پہاڑ

لے چونکہ اُس کا ایک تارہ آسمان کے قطب کے بالکل ہی قریب ہے یعنی وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور تمام ستارے اُس کا طواف کرتے ہیں اس لئے نہ صرف اُس ستارے کو بلکہ پورے مجموعہ کو جس میں وہ تارہ ہے امریکن ہندیوں نے خدا مان لیا اور غالباً اُس زمانہ کی یاد گاہ ہے جب وہ قطب شمالی پر آباد تھے۔

متعلق بتلاتے ہیں کہ یہ وہی پہاڑ ہے جسے عقاب نے بنایا تھا۔

یہاں پر بھی آپ دیکھتے ہیں کہ شروع میں پانی کو موجود مانا جاتا ہے جس میں زمین ڈوبی رہتی ہے زمین کو ایک بھڑا اور عقاب جزیرے کی صورت میں باہر نکالتے ہیں۔ بھڑے سے مراد دُبِ اصغر ہے اور عقاب سے آفتاب۔ یہاں پر دونوں کو آفریدگار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ قطب شمالی پر چھ مہینے کا دن ہوتا ہے اور چھ مہینے کی رات۔ دن کا حکمراں آفتاب کو مانا جاتا تھا اور رات کا دُبِ اصغر۔ رہا دریائے کلا ماتھ کے قریب کا پہاڑ سووہ قطبی جزیرے کے وسطی پہاڑ کے قائم مقام ہے۔

کرد ہندیوں کی روایت کرد ہندی بھی جو مونٹانا میں آباد ہیں تخلیقِ عالم ایک بھڑے سے منسوب کرتے ہیں جسے وہ ”اسی - ساہ - کوار - تے“ یعنی ”پرانا بھڑیا آدمی“ کہتے ہیں۔ ان کی روایت کے مطابق شروع میں بالکل زمین نہ تھی صرف پانی تھا اور اس پانی پر وہ بھڑیا گھومتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے چند بطخیں دیکھیں جو نہ تھیں۔ اُس نے کہا ”بھائی یہاں آؤ“ وہ بطخیں وہاں گئے اور بھڑیا بولا ”بھائیو! ہمارے لئے صرف اس پانی پر رہنا اچھا نہیں“ اُس نے اُنھیں بتایا کہ اس پانی کے نیچے زمین ہے تم میں سے کوئی پانی کے نیچے جاؤ اور وہاں سے کچھ مٹی اپنے منہ میں لے آؤ۔

اُن میں سے ایک بطخ پانی کے اندر گیا لیکن اُسے مٹی نہ ملی اور وہ خالی منہ واپس آگیا۔ ایک دوسرے بطخ نے کہا ”بھئی اب مجھے جانے دو“ چنانچہ وہ گیا اور غوطہ مارا لیکن بغیر مٹی کے واپس آگیا۔ تیسرے نے کہا ”اب میں نیچے جاتا ہوں“ وہ کافی دیر تک وہاں رہا لیکن بغیر مٹی کے واپس آیا۔

چوتھے بطخ نے کہا ”تم مجھے کیوں نہیں بھیجتے“ وہ نیچے گیا اور کچھ بالو اپنے منہ میں لے آیا۔ اُس نے وہ بالو ”اسی - ساہ - کوار - تے“ کو دی اور بولا ”لو بھئی یہ رہی تمھاری بالو“۔

اسی - ساہ - کوار - تے وہ بالو اپنے ہاتھ میں پکڑے رہا یہاں تک کہ وہ سوکھ گئی۔ وہ بطخوں سے بولا ”جب میں اس دھول کو چاروں طرف بکھراؤں گا تو ایک بڑا ملک طیار ہو جائے گا“ اُس نے بالو کو چار دفعہ کر کے پھینکا اور زمین بنتی اور بڑھتی چلی گئی اور پانی بالکل نہ رہا۔ اُس نے زمین کو بالکل ہموار میدان بنایا۔

اسی - ساہ - کوار - تے نے بطخوں سے کہا کہ زمین پر تو کچھ بھی نہیں ہے میں ایک پہاڑ بناؤں گا دریا بناؤں گا اور ہر قسم کے درخت اور پودے جیسا شاہ دانہ، آلوچہ اور شلجم وغیرہ۔

کرد ہندی دیومنگ میں شیر پڑان کے قریب ایک پہاڑ کی چوٹی دکھاتے ہیں جس کا نام کلاؤڈس پیک (بادلوں کی چوٹی) ہے اور کہتے ہیں یہی وہ پہاڑ ہے جسے ”اسی - ساہ - کوار - تے“ نے بنایا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں پر تخلیقِ عالم کا کام شروع ہوا تھا۔

یہاں پر آپ ایک خاص بات دیکھیں گے کہ ساری زمین کو بیک وقت جزیرے کی صورت میں باہر نہیں نکالا جاتا بلکہ پانی کی تہ سے ذرا سی مٹی باہر لائی جاتی ہے اور اُس سے ساری زمین طیار کر دی جاتی ہے۔ یہ چیز بہت سی قوموں کی ٹکونی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔

یہاں پر آفریدگار کی حیثیت سے ایک بھڑے اور چند بطخوں کو پیش کیا گیا ہے۔ بھڑے سے مراد دُبِ اصغر ہے اور بطخ سے آفتاب۔ (ایک کے بجائے چار بطخوں کا ذکر غلط بیانی ہے) آفتاب کو بطخ سے استعارہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ قوم جو سمندر کے کنارے آباد ہو آفتاب کو پانی سے طلوع ہوتے ہوئے دیکھے گی۔ یہ نظارہ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر بھی دیکھا

جاسکتا ہے) اور پانی پر ٹنگے ہوئے آفتاب کو پانی پر تیرتے ہوئے بطح سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ روڈس کے ایک برتن پر ایک مہنس اور ایک کنول کی تصویر پائی جاتی ہے اور ڈاکٹر ہیڈن کا خیال ہے کہ یہ دونوں آفتاب کی علامتیں ہیں

آفتابی مہنس اور کنول کی تصویر
(جزیرہ رمہوس کے ایک برتن سے)



کردک ہندیوں کی روایت کے بطح کا مقابلہ کرو ہندیوں کے عقاب سے کیا جاسکتا ہے۔ بھیڑیا دونوں میں مشترک رہی بادلوں کی چوٹی سو وہ قطبی پہاڑ کی یادگار ہے۔

الگان کوئی لوگوں کی روایت
الگان کوئی لوگوں کے مطابق اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک خرگوش تھا جس کا نام منی بوشو یا مشابو تھا (اس لفظ کے معنی آفتاب کے بھی ہیں) ایک دن مشابو کھیل رہا تھا کہ اُس کے بھیڑئے جنھیں وہ کتوں کے طور پر استعمال کرتا تھا ایک بڑی جھیل میں گھس پڑے اور غائر ہو گئے۔ اُنھیں بچانے کے لئے وہ بھی اُس جھیل میں کود پڑا لیکن دفعتاً اُس کا پانی بڑھنے لگا اور لہریں ہو کر کناروں پر پہنچے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری زمین ڈوب گئی۔

مشابو نے ایک پہاڑی کوٹے کو اُس جھیل میں بھیجا تاکہ وہ وہاں سے کچھ مٹی لائے جس سے زمین بنائی جاسکے لیکن مٹی تلاش کر کے وہ کوآ واپس لوٹ آیا اور بتایا کہ اُسے مٹی نہیں ملی۔ تب اُس نے اود بلاؤ کو غوطہ مارنے کا حکم دیا لیکن وہ بھی بغیر مٹی کے واپس لوٹ آیا۔ آخر اُس نے ایک چھپھوند کو بھیجا جو مٹی کا ذرا سا ایک ٹکڑا لے کر آئی جس سے مشابو نے زمین کو بنادیا۔

اس کے بعد اُس نے اُس بدخواہ روح سے بدلہ لیا جس نے یہ طوفان پیدا کیا تھا اور پھر چھپھوند سے شادی کی مدد سے اُس نے دنیا کو آباد کیا۔

یہ روایت قدرے اختلافات کے ساتھ مختلف قبیلوں میں بیان کی جاتی ہے۔ اوجوے لوگوں کے مطابق (جو الگان کو لوگوں کی ایک شاخ ہیں) یہ طوفان ایک کالے سانپ نے پیدا کیا تھا جو انسان اور دوسری مخلوقات کا دشمن ہے۔ طوفان کے ہیرو منی بوشو نے اُس سانپ کو قتل کر دیا اور اس قتل کی پاداش میں ایک زبردست طوفان آیا جس میں سارا دنیا غرق ہو گئی۔ منی بوشو سب سے اونچے پہاڑوں پر بھاگا اور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ پانی بھی اُس کے ساتھ ساتھ اونچا ہوتا گیا۔ اُس نے تین مرتبہ کہا ”بڑھ“ اور ہر مرتبہ درخت اونچا ہو گیا لیکن آخر میں پانی اُس کی ٹھوڑی تک پہنچ گیا تب اُس نے سول مچھلی کو مٹی لینے کے لئے بھیجا اور اُس کے پیچھے چھپھوند کو بھی روانہ کیا۔ لیکن دونوں ڈوب گئے اور اُن کی لاشیں تیر کر پانی کے اوپر آ گئیں۔ تب منی بوشو نے چھپھوند کے جسم میں جان پھونکی اور ابکی مرتبہ وہ اپنے بیٹوں میں ذرا سی

لے ایک دوسری روایت میں مرغابی بھیجنے کا ذکر ہے جس نے کئی مرتبہ غوطہ لگایا مگر ناکام رہی۔

نکر آئی جسے منی بوشو نے پاروں طرہ پھینکا اور چھوٹے چھوٹے جزیرے بن گئے جنہوں نے ملکر ایک بڑے ملک یا زمین کی صورت اختیار کر لی۔

سیک اور فاکس ہندیوں (الگ ان کوئی لوگوں کی دوسری شاخ) کی روایت کے مطابق جب طوفان کے مہیرو نے یہ دیکھا کہ جس پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں وہ ڈوب جائے گی تو اُس نے نیلے آسمان کا ایک ٹکڑا لیا اور اُس کی ایک ڈونگی (چھوٹی کشتی) بنائی جس میں بیٹھ کر وہ کئی دن تک تیرتا رہا۔ بالآخر اُس نے ایک بہت بڑی پھلی کو مٹی لانے کے لئے بھیجا جو اپنے عمیق منہ میں بہت سی مٹی بھر کر لائی اور اُس سے طوفان کے مہیرو نے زمین کو بنایا۔

ان روایات میں آپ صاف طور پر یہ بات دیکھتے ہیں کہ پیدائش زمین یا پیدائش عالم، طوفان نوح کے بعد کا واقعہ ہے پہلے انہیں۔ اور ایسا ہونا ہی چاہئے۔ جب انسان مخلوقات میں سب سے بعد میں پیدا ہوا تو پھر وہ کیسے پیدائش عالم کا مشاہدہ کر سکتا تھا۔

الغرض ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ پیدائش عالم (پیدائش زمین کہنا زیادہ مناسب ہوگا) سے متعلق جو روایتیں مہذب و رنیم مہذب اقوام کے مذہبی ادب میں بتائی جاتی ہیں ان کا تعلق صرف ان کے ظاہری مشاہدہ سے تھا جو غالباً قطبی جزیرے کی عراقی اور اُس کے دوبارہ نمودار ہوتے وقت ان کے سامنے آئے۔ قدامت کی زمین محض قطبی جزیرہ تھی۔ (اُنھیں ساری دنیا کا علم نہ تھا) جب وہ ڈوب گیا تو اُنھوں نے کہا ساری دنیا ڈوب گئی اور اُن لوگوں نے جو اُس کی عراقی یا رنیم عراقی کے بعد باقی بچے اُس کے دوبارہ نمودار ہونے کو پیدائش زمین کہا اور اسی سلسلہ میں چاند، سورج اور دوسری مخلوقات کی پیدائش اُس حد تک بیان کر دی جہاں تک اُن کی قیاس آرائی کی قوت نے اُن کا ساتھ دیا۔

الگ ان کوئی لوگوں کی روایت کا مہیرو ایک خرگوش ہے جس کا نام منی بوشو یا مشابو تھا۔ اس لفظ کے معنی آفتاب کے بھی ہیں۔ یہ چیز نہایت ہی اہم ہے۔ کیونکہ میں تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ تکوین عالم کی روایتوں میں عام طور سے آفتاب کو آفریدگار کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ چھپو مندر جو منی بوشو کو مٹی لاکر دیتی ہے غالباً دُب اصغر ہے اور وہ جمیل جس میں زمین ڈوب جاتی ہے بحر آرکٹک اور زمین قطبی جزیرہ ہو۔ جب وہ عراق ہوگا تو یقیناً بحر آرکٹک کے آس پاس کے ساحل ڈوب گئے ہوں گے اور جبکہ وہ جزیرہ پانی سے دوبارہ نمودار ہوا تو یہ بتایا گیا کہ اسے بعض جانوروں نے باہر نکالا۔

ارا کوئی لوگوں کی روایت کے مطابق شروع میں آسمان اور پانی کا وجود تھا۔ آسمان پر ایک عورت رہتی تھی جس کا نام آتا اینتیک تھا۔ اُسے آسمان (یا اُس کے ایک سوراخ) سے نیچے پھینک دیا گیا۔ جانوروں نے جو پانی میں رہتے تھے یہ طے کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا کہ اُس عورت کے ٹھہرنے کے لئے کیا بندوبست کیا جائے۔ کچھوے نے اُسے اپنی پیٹھ پر روک لیا اور مرغابیوں کی لائی ہوئی کیچڑ یا بالو سے زمین تیار کی گئی کہتے ہیں یہ عورت پہلے سے حاملہ تھی۔ زمین پر آنے کے بعد اُس نے ایک لڑکی کو جنم دیا اور اُس لڑکی سے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام جو سکیہا تھا اور دوسرے کا تادسکارا۔ اب ایک روایت ہے کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا (جیسے اسلامی روایت میں قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا) اور دوسری روایت ہے کہ تادسکارا نے اپنی ماں کو قتل کر دیا جس کی لاش سے پودے پیدا ہوئے (یہاں پر مجھے غالب کا یہ شعر یاد آتا ہے:-

سب کچھ کہاں لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں)

اس کے بعد وہ مغرب کی طرف بھاگ گیا جہاں وہ مردوں پر حکمرانی کرتا ہے (اسی طرح قاتن بھی خداوند کے حضور سے غائب ہو گیا تھا اور زمین پر آوارہ اور پریشان ہوا) جو سیکھا نے انسانوں اور جانوروں کو بنایا اور انسان کو تہذیب اور مدنیت کو تعلیم دینے کے بعد مشرق کی طرف روپوش ہوا جہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ رہتا ہے۔

مذکورہ بالا قصہ کو ایک دوسری طرح سے بھی بیان کیا جاتا ہے یعنی تخلیق عالم سے پہلے چھ مرد فضا میں رہتے تھے لیکن ان میں کوئی عورت نہ تھی جو ان کی نسل کو باقی رکھتی۔ آخر انھیں معلوم ہوا کہ بہشت میں ایک عورت ہے (جو غالباً حور یا اپسرا رہی ہوگی) یہ طے پایا کہ ان میں سے کوئی وہاں جا کر اُسے لانے کی کوشش کرے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بہشت میں پہنچا کیسے جائے کیونکہ اگرچہ وہ فضا میں رہتے تھے لیکن عالم علوی تک پہنچنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

بہر حال کسی نہ کسی طرح ان میں سے ایک مرد کسی یزند کی پشت پر سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ اُس نے وہ عورت دیکھی اور اُسے تحفے پیش کر کے اور سبز باغ دکھا کر ورغلا یا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورت ”گمراہ“ ہو گئی۔ جب بڑے دینوں نے یہ بات دیکھی تو اُس عورت کو فوراً حوا کی طرح جنت سے نکال دیا۔

اب ایک روایت یہ ہے کہ جب وہ دنیا کی پہلی عورت آسمان سے نیچے گری تو کچھوے نے اُسے اپنی پیٹھ پر سنبھال لیا اور مرغابیوں کی لائی ہوئی مٹی سے زمین طیار کی گئی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ سگ آبی (میسور) اور مچھلیوں نے سمندر کی نہ سے مٹی لا کر اُس کچھوے کے گرد ایک چھوٹا سا جزیرہ بنا دیا جو دھیرے دھیرے بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ پوری زمین طیار ہو گئی۔ ایک تیسری روایت ہے کہ بعض جل بھومی جانوروں نے (جو خشکی اور تری دونوں پر رہتے ہیں مثلاً اود بکرا، سگ آبی اور چھچھوند) جب اُس عورت کو گرتے دیکھا تو فوراً سمندر کی تہ میں جا کر زمین کھودنے لگے تاکہ وہاں سے کافی مٹی لا کر اُس عورت کے ٹھہرنے کے لئے جزیرہ بنا دیں اور چوتھی روایت ہے کہ جب وہ عورت آسمان سے نیچے گری تو اُس کے ٹھہرنے کے لئے زمین نہ تھی لیکن دفعتاً اُس کے قدموں کے نیچے نمودار ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے پھیل گئی یہاں تک کہ ایک پورا ملک طیار ہو گیا۔ اس نگوینی کہانی سے پورے طور پر یہ بات ثابت ہے کہ امریکن ہندیوں کی زمین محض ایک جزیرہ تھی (اور ہمارے خیال میں قطبی جزیرہ) جو زمین کے اندرونی لاوے کے سمندر کے بیچ میں اُبل پڑنے سے پیدا ہوا تھا۔ اس جزیرے کو کچھوے سے استعارہ کیا جاتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو کچھوے کی پیٹھ بہت چوڑی چکلی پتھر کی سل کی طرح ہوتی ہے (فارسی میں کچھوے کو ”سنگ پشت“ کہتے ہیں) اور دوسرے یہ کہ پڑنے زمانہ میں یہ عقیدہ تھا کہ جزیرے پانی پر تیرتے ہیں (بظاہر وہ پانی پر تگے معلوم ہوتے ہیں) اسی طرح وہ کچھوے سے مشابہ لگتے ہیں۔ یہاں پر یہ بتانا بجا نہ ہوگا کہ امریکن ہندیوں کے تصویری رسم الخط میں زمین کے لئے کچھوے کی تصویر بنائی جاتی ہے اور میں تحقیق کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مذہب عالم کی اکثر روایتوں میں زمین کو کچھوے سے تشبیہ دی جاتی ہے یا کچھوے سے استعارہ کیا جاتا ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ ان کی زمین محض ایک جزیرہ ہے جو میرے خیال میں قطب شمالی پر واقع تھا۔

مذکورہ بالا روایت میں جس جزیرے کا نشان ملتا ہے وہ قطب شمالی پر تھا اس کا ایک ثبوت اس روایت کے کرداروں کے نام ہیں۔ آتا اینتیک کے معنی ”کائے جسم والی“ کے ہیں اس طرح وہ ہندوؤں کی کائی یا پاربتی کے مقابل ہے اور میرے خیال میں وہ قطبی پہاڑ کا (PERSONIFICATION) تھی۔ اُس کے دو پوتے تھے جن میں سے ایک کا نام جو سیکھا تھا اور دوسرے کا تاو سکارا۔ تاو سکارا کے معنی ”برفانی“ کے ہیں اور جو سیکھا کے ”پیارے چھوٹی کونیل“ اس طرح معلوم ہوا کہ آتا اینتیک سے قطبی پہاڑ مراد ہے۔ تاو سکارا سے اُس کی برف اور جو سیکھا سے قطبی پہاڑ سے اُس کے دانے دھواں جو درخت یا پودے سے مشابہ ہوتا ہے۔ (باقی)

محمد اسحاق صدیقی

نزع کفر و اسلام

شرک بت پرستی کی روایتی و عقلی حیثیت

اور

ہمارے موجودہ علماء کرام کا صحیح موقف

جس زمانہ میں پاکستان سے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی خبریں آرہی تھیں، اس وقت یہ سوال بھی میرے ذہن میں آیا تھا کہ غیر مسلم سے کیا مراد ہو سکتی ہے اور جماعت احرار نے یہ سبھی قسم کا نام کیوں تجویز کیا، کیا کوئی ایجابی اصطلاح ان کو نہ مل سکتی تھی۔ یعنی اگر احمدی جماعت ان کے نزدیک مسلم نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

غیر مسلم کا لفظ ایک حد تک بڑا مبہم لفظ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی جماعت یا فرد خاص کو غیر مسلم قرار دیتے وقت فقہی و مذہبی نقطہ نظر سے یہ بھی بتایا جائے کہ وہ مسلم نہیں تو کیا ہے؟۔ غیر مسلم کا لفظ قطعاً غیر مذہبی اور غیر اصطلاحی لفظ ہے اور اس کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے ہم کسی کو ہدمعاش کہتا چاہیں، لیکن ظاہر اس طرح کریں کہ اس کے اطوار شریفوں کے سے نہیں ہیں یا کسی بُرے شخص کو بُرا کہنے کی جگہ یوں کہیں کہ ”تم اچھے آدمی تیرے، تو اس قسم کا انداز بیان مجلسی تہذیب و شائستگی کے لحاظ سے تو بیشک اچھا ہے لیکن مذہب کے معاملہ میں ایسے فقروں سے کام نہیں چل سکتا۔

مجلس احرار کا احمدیوں کو صرف غیر مسلم کہنے پر اکتفا کرنا یقیناً مجلسی تہذیب سے تعلق نہ رکھتا تھا بلکہ غالباً اسلئے کہ وہ احمدیوں کو ”کافر و مشرک“ کہنے کی جرأت نہ کر سکتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اگر وہ ان کے لئے یہ اصطلاحیں استعمال کریں گے تو غالباً وہ اپنے ہمنوا زیادہ نہ پیدا کر سکیں گے۔ یہ چند سطر ہی تو صرف تہذیب و تمدن کے دورہ اس وقت احمدی و غیر احمدی مسئلہ پر اظہار خیال میرا مقصود نہیں ہے، بلکہ کفر و اسلام یا ذرا پرستی و بت پرستی پر پہلے خالص مذہبی و روایاتی کو پیش کر کے یہ بتانا ہے کہ اب اس سوال پر بالکل نئے زاویہ نظر سے غور کرنے کی ضرورت ہے اور توحید و بت پرستی کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ آئیے سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ ایک غیر مسلم کی حیثیت مذہبی و فقہی نقطہ نظر سے کیا ہے۔

غیر مسلم کے مقابلہ میں دو بہت کھلے ہوئے الفاظ قرآن میں استعمال کئے گئے ہیں:۔ ”کافر و مشرک“ لیکن سی کے ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر وہ شخص جو دائرہ اسلام سے خارج ہے، کافر یا مشرک ضرور ہوگا۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہم کو سب سے پہلے مسلم، کافر اور مشرک ان تینوں اصطلاحوں پر غور کر کے معلوم کرنا ہے کہ قرآن یا شارع نے ان الفاظ کا کیا مفہوم مراد لیا ہے۔

اس کے لئے ہم کو قرآن، حدیث اور تاریخ سبھی کی ورق گردانی کرنا پڑے گی اور اگر ہم نے پورے شرح و بسط سے کام لینا چاہا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک مستقل کتاب کی طرح ہم نے ڈال دی۔ پھر اس وقت ہم اس کے لئے توفیاء نہیں

لیکن کوشش ضرور کریں گے کہ مختصراً لیکن جامعیت کے ساتھ اس موضوع سے متعلق تمام ضروری مباحث کو اس مضمون سمیٹ لیں۔

ایمان۔ اسلام۔ مسلم۔ مومن۔ اب آپ سب سے پہلے لفظ مسلم کو لیجئے۔ عرب لٹریچر میں مسلم کا لفظ صرف دین پر بول کر یہی مراد لی جاتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اس وقت اس لفظ کا استعمال زیادہ تر سوسائٹی یا کمیونٹی کے مفہوم میں ہے اور اس سے قبل عہد نبوی و قرونِ اولیٰ میں مسلم و مومن دونوں تقریباً ایک ہی مفہوم رکھتے تھے۔

قرآن میں مسلم اور مومن کے الفاظ متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن لفظ ایمان اور اس کے مشتقا بہ نسبت اسلام اور اس کے مشتقات کے بہت زیادہ استعمال کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ایک نئی سورت کا نام ہی ”المومنین“ لیکن معنوی حیثیت سے اسلام زیادہ وسیع چیز ہے یہاں تک کہ اسے بالکل فطری جذبہ قرار دیا گیا ہے اور رسول سے قبل جو پیغمبر آچکے تھے ان کے بتائے ہوئے مذہب کو بھی اسلام ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن میں اکثر جگہ اسلام و ایمان کا استعمال ایک ہی مفہوم میں ہوا ہے، لیکن کہیں کہیں صراحۃً ان میں تفریق بھی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوتا ہے:-

”قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا“

راہل عرب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ تو لے رسول ان سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ صرف اسلام لائے ہو (یعنی اطاعت قبول کر لی ہے) اور جب ایمان تمہارے دلوں میں سما جائے گا (یعنی اللہ و رسول کی (صحیح معنی میں) اطاعت کرو گے تو تمہارے اعمال (خیر) میں کوئی کمی نہ ہوگی)

اس کے علاوہ اور بھی بعض آیات ایسی ہیں جن سے ایمان و اسلام کے مفہوم کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور اسی لئے ان کا مفہوم متعین کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

لغوی حیثیت سے لفظ ایمان کا مادہ امن ہے جس کے معنی ہیں:- اطمینان نفس، بے خوفی اور اعتماد کے۔ اسی لئے قرآن ایمان کا اصطلاحی مفہوم قرار پایا:- ”اللَّهُ، اس کے رسول اور رسول کے پیغامات پر بھروسہ کرنا“ (احیاء العلوم - غزالی) غزالی کی یہ تعریف بھی مبہم ہے۔

رسول اللہ کی ایک حدیث ہے کہ ”جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہے وہ بھی آگ سے محفوظ رہے گا“ اس حدیث فقہاء نے بھی غور کیا اور متکلمین نے بھی اور یہ موثق گافیاں اتنی بڑھیں کہ ایمان کا صحیح مفہوم متعین ہونے کے بجائے اس میں اور گتھیاں پڑ گئیں۔

اشعری و ماتریدی جماعت نے بتایا کہ ایمان کا تعلق صرف قلب سے ہے، حنفی جماعت نے اس کے ساتھ زبان سے اس کی تصدیق ضروری قرار دی اور خارجیوں نے عمل کو بھی لازم ٹھہرایا۔ قرامطہ نے صرف زبان سے اقرار کر لینا کافی سمجھا اور جبروتوں نے کہا کہ ایمان نام ہے معرفت خدا و قرآن کا عقل کے ذریعہ سے۔ اسلام پرست مسلمانوں نے ایمان رکھا قلبی، اخلاقی، اعتقاد کا اور اسی کے ساتھ زبان سے اس کے اظہار کا لیکن عمل خیر کو ضروری نہیں قرار نہیں دیا۔ مرتبہ بلند حاصل کرنے کے لئے اعمال حسنہ بھی ضروری تھے۔ معتزلہ نے ایک اور نئی صورت پیش کی وہ یہ کہ اگر کوئی مسلم کسی ایک گناہ کبیرہ کا بھی مرتکب ہو تو وہ نہ مسلمان ہے نہ کافر بلکہ منافق ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، مرجیہ اور خارجی

ایک دوسرے کے بالکل ضد تھے۔ خارجی تو اعمالِ حسنہ اور گناہوں سے احتراز کو بھی اسلام، ایمان کی ضروری شرط قرار دیتے تھے، لیکن مرجیہ جماعت کہتی تھی کہ ہر وہ شخص جو اپنے کو مسلم کہتا ہے، مسلم ہے۔ یہ جماعت ابتداءً عہدِ اسلام میں اسی وقت پیدا ہو گئی تھی جب لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ دل سے کون ایمان لایا ہے اور کس نے ظاہر داری سے کام لیا ہے۔ اس صورت میں انھوں نے یہی فیصلہ مناسب سمجھا کہ ہر وہ شخص جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتا ہے مسلمان ہے اور ہمیں اس کے اعمال و افعال کے احتساب کی ضرورت نہیں اسی کے ساتھ یہ بحث شروع ہوئی کہ ایمان کے کوئی مدارج ہیں یا نہیں یعنی اس میں کمی یا زیادتی کا سوال پیدا ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلہ میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے، ایک تو اس بات کا قائل تھا کہ ایمان میں کمی یا زیادتی کے کوئی معنی نہیں (الایمان لا یزید ولا ینقص) لیکن یہ بات چونکہ رسول اللہ کی اس حدیث کے خلاف تھی جس میں ذرہ برابر ایمان رکھنے والے کو بھی جنت کی بشارت دی گئی ہے، اس لئے علماء کا رجحان زیادہ تر یہی رہا کہ ایمان میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا علم صرف اعمالِ حسنہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے مدارج ایمان متعین کرنے میں ایک مسلمان کے کردار ہی کو دیکھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اب آئیے لفظ کفر کے مفہوم پر غور کریں، یہ لفظ قرآن میں معہ اپنے تمام مشتقات کے بہ کثرت استعمال ہوا ہے۔ **کفر - کافر ہے۔** کہیں محض جھوٹ و انکار یا ناشکر گزاری کے لغوی معنی میں اور کہیں اصطلاحی حیثیت سے جو مومن یا مسلم کی ضد ہے۔

قرآن میں سب سے پہلے سورہ المدثر میں کافرین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ الہامی ترتیب کے لحاظ سے مکی سورتوں میں سورہ المزمل کے بعد یہ دوسری صورت ہے جو رسول اللہ پر نازل ہوئی۔ لفظ کافر سب سے پہلے ان اہل مکہ کے لئے استعمال کیا گیا جنھوں نے اسلام لانے سے انکار کیا اور رسول اللہ کو جھٹلایا۔ ابتدائی مکی سورتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کا طرز عمل کفار مکہ کے ساتھ اس امید پر کہ شاید وہ اسلام لے آئیں اول اول ایک حد تک روادار رہا، لیکن جب بالکل مایوسی ہو گئی تو پھر ان سے بالکل مقاطعہ کی ہدایت کر دی گئی (سورہ آل عمران - آیت ۲۷)۔ علاوہ اس کے بہت سی آیتیں کلام مجید میں ایسی بھی ہیں جن سے کافروں کے انجام کا عمومی ذکر کیا گیا ہے۔

احادیث میں کافی تفصیل کے ساتھ کفر و کافر سے بحث کی گئی ہے، لیکن مثل مشہور ہے ”نحو منھ تنو باتیں“ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسئلہ سلجھنے کے بجائے زیادہ الجھ گیا اور کفر و شرک کی خدا جانے کتنی صورتیں نکل آئیں اور اس سلسلہ میں ملحد، مرتد، منافق، فاسق اور فاجر وغیرہ کی متعدد اصطلاحیں وجود میں آ گئیں اور کفر کی بہت سی قسمیں ہو گئیں مثلاً:-
(۱) کفر انکار (یعنی خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنا)۔ (۲) کفر جھوٹ (یعنی خدا کے وجود کو تو ماننا لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرنا)۔ (۳) کفر المعاندہ (یعنی خدا کے وجود کا اقرار کرنے کے بعد محض بغض و عناد کی وجہ سے اسلام نہ لانا)۔ (۴) کفر النفاق (یعنی ظاہر میں تو خدا کا قائل ہونا لیکن باطناً اس سے انکار)

اس چھان بین کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس باب میں خارجی، معتزلہ، مرجیہ، عبادیہ، قرامطہ، اشاعرہ، ماتریدی، اہل حدیث وغیرہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے۔

حدیث کے بعد فقہی لٹریچر کو دیکھئے تو یہاں بھی یہی اختلاف نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے تو فقہاء نے غور کیا کہ کافر پاک ہے یا ناپاک اور اس میں اختلاف پیدا ہوا۔ ناپاک کہنے والوں میں شیعہ جماعت نے سختی کے ساتھ کفار کو نجس قرار دیا۔ (یعنی ان کے نزدیک جو دس نجاستیں پیشاب پاخانہ کی قسم کی ہیں انھیں میں کافر بھی شامل ہے اور اسی لئے وہ غیر مسلم کی چھوٹی ہوئی چیز کھانا بھی حایز نہیں سمجھتے) لیکن اور جماعتوں نے اس قدر سختی سے کام نہیں لیا اور پاکی یا ناپاکی میں

کافر و مسلم دونوں کو ایک حکم میں رکھا کیونکہ نجاست کا تعلق ظاہری اشیاء سے ہے۔ پھر اسی سلسلہ میں اہل کتاب کے متہ غور کیا گیا کہ وہ کس قسم کے کافر ہیں اور انہیں ہلکے قسم کا کافر قرار دیکر ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا یا ان کے ساتھ رسم ازواج قائم کرنا جائز مانا گیا۔ جہاد کے سلسلہ میں جب کفار کی بستیوں کو دارالحرب قرار دیکر جہاد فرض کفایہ قرار دیا گیا تو اہل کتاب کے لئے یہ رعایت رواد رکھی گئی کہ وہ جزیہ یا خراج ادا کر کے ذمی بن سکتے تھے اور ان کو امان مل سکتی تھی۔

اسی سلسلہ میں مرتد اور کافر کے درمیان بھی تفریق کی گئی کہ اگر مرتد دوبارہ اسلام نہ لائے تو اسے قتل کر دیا اور کافر کے لئے قتل کے سوا اور کوئی صورت مفر کی نہ رکھی گئی مگر یہ کہ وہ جنگی قیدی ہونے کے بعد غلام بنائے جائیں۔ اس مسئلہ کو اگر تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کفر و کفار کے مفہوم اور ان کی تعبیر میں زمانہ ساتھ ساتھ بہت تبدیلیاں ہوئیں اول اول عہد رسالت میں کفار سے مراد صرف وہی اہل عرب تھے جو رسول اللہ کے مخالف و دشمن تھے اور اسلام کی راہ میں سنگ گراں بنے ہوئے تھے، اس وقت کفر و اسلام کی تفریق کا صرف یہ مفہوم تھا کہ کون رسول اللہ کا دوست ہے اور کون دشمن، اس کے بعد عہد خلفاء میں جب فتوحات کا آغاز ہوا اور پیروان اسلام کو معلوم ہوا کہ اسلام میں دین کے ساتھ دنیا بھی شامل ہے تو پھر مصروعیم پر حملہ کرنے کے لئے ”کفر و شرک“ کو سبب اصل قرار دیا گیا۔ اس کے بعد جب حکومت اسلام وسیع ہوئی اور جہانگیری جذبہ ایک حد تک پورا ہو گیا تو پھر کئی صدی تک کفر و اسلام کے مسئلہ کو مذہب سے زیادہ سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جانے لگا اور صلیبی جنگوں کے زمانہ تک کفار اور خصوصاً اہل کتاب کفار کے ساتھ مسلمانوں نے بڑی رواداری سے کام لیا، یہاں تک کہ ان کو بڑے بڑے منصب عطا کئے اور کفر و کفار کے خلاف تعصب قریب قریب ختم ہو گیا۔ لیکن جب اس کے بعد ترکوں اور عیسائیوں کے درمیان صلیبی جنگیں شروع ہوئیں تو عوام میں جذبہ جہاد تازہ کرنے کے لئے پھر کافر و مسلم کی تفریق کا سوال سامنے لایا گیا۔ اس کے بعد جب اسلامی حکومتوں کو زوال شروع ہوا اور ان کا سیاسی اقتدار کم ہونے لگا تو اس جذبہ میں اور اشتداد پیدا ہوا کیونکہ مسلمان مغلوب ہو کر اب اپنی تسکین اسی طرح کر سکتے تھے کہ وہ مذہبی حیثیت سے اپنا تفوق ثابت کریں اور غیر مسلموں کو غلام مقہور و مغضوب قرار دیں۔

تصوف نے اس مسئلہ کو بالکل دوسری نگاہ سے دیکھا اور اس نے روحانیت کے مقابلہ میں تفریق مذہب اور کفر و اسلام دونوں کو پس پشت ڈال کر صرف توحید اور توحید بھی وہ جسے ان کی اصطلاح میں وحدت الوجود میں اصل چیز قرار دیکر فیصلہ کر دیا کہ:-

کفر و اسلام در رمہش پویاں

وحدہ لا الہ لہ گویاں

اب آئیے شرک و مشرک کی حقیقت کو بھی سمجھ لیں۔

شرک و مشرک

شرک کے اصطلاحی معنی میں خدا کو ایک نہ ماننا بلکہ اس کی خدائی میں کسی اور کو شریک قرار دینا، لیکن عجیب بات ہے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں شرک یا مشرک کا کہیں ذکر نہیں پایا جاتا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تک رسول اللہ خود اپنے تصفیہ اخلاق و تزکیہ روح کی منزل سے نہیں گزرے اس وقت تک ان دوسروں کی طرف توجہ نہیں ہوئی اور جب اسکے بعد انہوں نے تبلیغ اسلام شروع کی اور لوگوں کی طرف سے مخالفہ شروع ہوئی تو پھر انہیں مشرک قرار دیکر ان سے احتراز کی ہدایت کی۔

مشرکوں کا ذکر قرآن میں بہت جگہ آیا ہے اور تمام آیتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مشرک کہنا

بت پرستی کی وجہ سے تھا۔ وہ بتوں کے سامنے اسی طرح التجائیں لے جاتے تھے جس طرح خدا کے سامنے کوئی لے جائے اور انھیں یقین تھا کہ ان کی زندگی کے صلاح و فساد انھیں بتوں کی خوشنودی یا برہمی پر منحصر ہے۔

مشرکوں کو کلام مجید میں طرح طرح کے عذاب آخرت سے ڈرایا گیا ہے اور سورہ برائت (۲۸) میں آیت میں انھیں تجسّس دنا پاک ظاہر کیا گیا ہے۔ الغرض کافر و مشرک میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ کافر بہت عام اصطلاح ہے جس میں مشرک اور اسلام نہ لانے والے اہل کتاب بھی شامل ہیں اور مشرک کی تعریف میں اہل کتاب کو شامل کرنے کے باب میں اختلاف ہے۔ بعض کا فیصلہ یہ ہے کہ اہل کتاب بھی مشرکین میں شامل ہیں، بعض مفسرین نے اہل کتاب کو بت پرست قرار نہ دیکر مشرک تسلیم نہیں کیا اور قرآن میں بھی جہاں جہاں لفظ مشرک استعمال ہوا ہے وہاں ”بت پرستی یا شرک فی التوحید“ ہی مراد لیا گیا ہے۔ احادیث میں بھی شرک کا ذکر اسی مفہوم میں کیا گیا ہے اور اہل فقہ نے جو مسائل اس سلسلہ میں بیان کئے ہیں مثلاً خراج، جزئیہ، جہاد، دار الحرب، نکاح اور غلامی ان سب کی بنیاد یہی مفہوم ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ شرک یا مشرک کی تعین و تعریف میں کوئی اختلاف نہیں پایا گیا، غلط ہے، معتزلہ نے شرک کے لئے یہ شرط ضروری قرار دی کہ صفات خداوندی میں کسی کو شریک ٹھہرا کر اسے خدا ہی کی طرح ادنیٰ و اعلیٰ مانا جائے۔

الموصدین کے یہاں عقیدہ توحید زیادہ سخت تھا، وہ ان لوگوں کو بھی شرک قرار دیتے تھے جو قرآن کو غیر مخلوق سمجھتے تھے، کیونکہ اس طرح قرآن بھی خدا کی طرح ادنیٰ و اعلیٰ چیز ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے سوا دوسری مسلم جماعتوں کو بھی مشرک کہتے تھے کیونکہ وہ ان کے عقیدہ توحید کے نظریہ سے صحیح معنی میں خدا کی وحدانیت کے قائل نہ تھے۔ اسماعیلیہ بھی اپنے آپ کو موصدین کہلانا پسند کرتے تھے لیکن چونکہ ان کے یہاں امام کی حیثیت بھی دوسرے خدا ہی کی سی تھی، اس لئے ان کا یہ دعویٰ چل نہ سکا اور وہ انھیں خود اپنی کمتری کا احساس ہونے لگا۔ وہابیوں کے یہاں شرک کا مفہوم اس قدر وسیع ہو گیا کہ ان کے سوا دنیا میں کوئی مسلمان باقی نہ رہا۔

ان کے یہاں شرک کی کئی قسمیں (۱) شرک العلم :- یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ علم غیب، خدا کے سوا کسی اور کو بھی حاصل ہو سکتا ہے ان کے نزدیک شرک ہے اور اس نقطہ نظر سے وہ لوگ جو انبیاء کو حامل علم غیب سمجھتے تھے یا علم نجوم کی مدد سے پیش گوئیاں کرتے تھے سب مشرک قرار پائے۔ (۲) شرک التصرف :- یعنی یہ اعتقاد کہ خدا کے سوا کوئی اور کسی امر کے وقوع یا عدم وقوع پر اختیار رکھتا ہے، اس لئے ان کے نزدیک اولیاء کرام کے کرامات یا شفاعت رسل کو ماننے والے بھی مشرک ہیں۔ (۳) شرک العبادۃ :- خدا کے سوا کسی اور کے سامنے جھکنا یہاں تک کہ انبیاء و اولیاء کے مزاروں پر جانا، قبروں کا طواف کرنا دعا، تعویذ، گنڈا، فاتحہ، عرس وغیرہ سب شرک میں داخل ہے۔ (۴) شرک العبادۃ :- یعنی فال، استخارہ، شگون، یا اس طرح کے نام رکھنا جس سے خدا کے علاوہ کسی اور کی عبدیت ظاہر ہو جیسے عبدالنہی یا غلام محمد ان کے نزدیک شرک ہے۔ (۵) شرک الآداب :- یعنی پیغمبروں، ولیوں، اماموں یا پیروں کی قسم کھانا۔ یا ان کا نام لیکر ان سے مدد چاہنا اور یا محمد، یا علی وغیرہ کے الفاظ استعمال کرنا یہ سب ان کے نزدیک شرک ہے۔

”اخلاقیین“ کا نظریہ اس باب میں زیادہ بلند و لطیف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شعائر مذہب کی پابندی (مثلاً روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ) اس خیال سے کہ اس کی مُزد اسی دنیا میں ملے گی، یا یہ کہ اس سے کوئی خوش ہوگا اور تعریف کرے گا شرک ہے، ان کے نزدیک ہر عمل کو خالصتاً لوجہ اللہ ہونا چاہئے اور اس میں کوئی شائبہ دنیا کا نہ پایا جانا چاہئے، اس مسئلہ میں ان کے غلو کا یہ عالم ہے کہ جذبہ انانیت اور تکبر و غرور کو بھی شرک قرار دیتے ہیں۔ مگر انھوں نے شرک کی شدت و خفت کے ساتھ اس کے درج بھی مقرر کر دیے ہیں جن کو وہ اپنی اصطلاح میں شرک الصغیر، شرک الصغیر اور شرک العظیم کہتے ہیں۔

اب صوفیہ کی موٹگافیاں ملاحظہ فرمائیے، ان کے یہاں شرک کی دو قسمیں ہیں شرک خفی اور شرک جلی۔ ان کے یہاں اصل چیز توحید الی اللہ ہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ درمیان میں کوئی چیز ذریعہ یا واسطہ کی صورت سے بھی حایل نہ ہو یہاں تک کہ اگر نفس یا روح کے متعلق یہ خیال قائم کر لیا گیا کہ بذات خود اس میں کوئی نیکی پائی جاسکتی ہے تو یہ ان کے نزدیک شرک خفی کہلائے گا۔ آپ یہ سن کر غالباً تعجب کریں گے کہ کسی کا یہ کہنا کہ میں خدا کو جانتا ہوں۔ ان کے یہاں شرک ہے کیونکہ اس طرح وہ گویا نفس علم کے باب میں جو صرف خدا کے لئے مخصوص، اپنے تئیں خدا کا شریک ٹھہراتا ہے۔ اس باب میں ان کا غلو اس حد تک بڑھ گیا کہ ابن عربی کے ایک شاگرد تلمسانی نے یہاں تک کہہ دیا کہ ”قرآن بھی شرک ہے کیونکہ خالص عقیدہ توحید میں وہ بھی حایل ہوتا ہے۔“

نظریہ نیاز یہاں تک آپ نے قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف کے نقطہ نظر سے شرک و اسلام کا مطالعہ کر لیا اور آپ ان کو پڑھ کر مطمئن ہوئے ہوں یا نہیں ہمیں اس سے بحث نہیں، لیکن یہ تو بہر حال آپ کو ماننا ہوگا کہ ان تمام نظریوں کا تعلق اُس زمانہ سے تھا جو ختم ہو گیا اور اب ان کو سامنے رکھ کر ہم کسی ایسے صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے جو موجودہ دور انسانیت کی اُلجھنوں کو دور کرنے اور زندگی کی صحیح راہ متعین کرنے میں ہماری مدد کر سکے۔ اس لئے اب آئیے حالات حاضرہ کو سامنے رکھ کر خالص فلسفیانہ نقطہ نظر سے غور کریں کہ شرک و اسلام کی حقیقت کیا ہے، توحید و بت پرستی سے کیا مقصود ہے اور ہمارے موجودہ علماء اسلام کا صحیح موقف اس باب میں کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے پرستی کی شدید مخالفت کی، اور جس کے علمبرداروں نے اپنے آپ کو ”بت شکن“ کہلانے کے لئے نہ ہمالیہ کی بلندیوں کی پروا کی اور نہ بحر ہند کی گہرائیوں کی۔ وہ موردِ تلخ کی تعداد میں فوجیں فراہم کر کے اُٹھے، ضرور و سیل کی طرح نہ رکنے والا عزم لے کر آگے بڑھے اور برقِ زلزلہ کے مانند ہر اس ہتکدہ کو تباہ و برباد کر گئے جو ان کے سامنے آیا۔ ان کا ہر قدم جو اس غرض سے اُٹھتا تھا ”جنتِ عدا سے قریب تر کر دینے والا ہوتا تھا اور تیشہ کی ہر وہ ضرب جو کسی بت پر پڑتی تھی گویا قصرِ فردوس کی تعمیر کی مترادف تھی وہ مذہب جس کی بنیاد ہی ”لات و مہل“ کی مسامی پر قائم ہوئی ہو اس کے متبعین میں یہی جوش و خروش ہونا چاہئے تھا اور ہر سو مناسبت کے لئے ان کے اندر ایک محمود کا پیدا ہو جانا ضروری تھا۔ لیکن صبح صادق کی نورانی صباحت میں جب منہ کے کسی گھنٹہ کی آواز میرے کانوں میں پڑتی ہے تو میں دیر تک سوچتا رہتا ہوں کہ ایک ”بت“ کا تعلق انسان کے کن جہت سے وابستہ ہے اور کیوں یہ اختلاف ہے کہ ایک طرف گزر گراں اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری طرف

”جنبہ کلید تہکدہ در دست برہمن“

یونٹو دنیا کا ہر پتھر جس کو ہم ٹھوکر لگاتے ہوئے گزر جاتے ہیں، بت بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اپنے اندر ایک ”ناتراشیدہ معبود“ چھپائے ہوئے ہے، لیکن نہ بت پرست اس کے سامنے اپنا سر جھکاتا ہے اور نہ ”بت شکن“ اس کے اپنا تیشہ صرف کرتا ہے۔ کیوں؟ آئیے آج کی صحبت میں اسی پر غور کریں، شاید تبیح و زنا کی گتھیوں کو اس طرح سلجھا سکیں کہ کہا جاتا ہے کہ کائنات کی تخلیق ”مادہ“ سے ہوئی ہے اور مادہ قدیم ہے ہمیں اس دعوے کے صدق و کذب پر اس وقت بحث کرنا مقصود نہیں، لیکن ہمارا تجزیہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ”محض مادہ“ کوئی قیمت نہیں رکھتا، اصل چیز جو اس کو با وقعت بناتی ہے وہ انسان کی ذہانت ہے جو اس پر صرف ہوتی ہے مٹی یوں کوئی قیمت نہیں رکھتی لیکن جس وقت اس سے کوئی برتن بنالیا جاتا ہے تو اس کی قیمت متعین ہو جاتی ہے، لہذا اپنے معدن کے اندر بیکار ہے لیکن جب انسان اسے باہر نکال کر دوسرے

شکلوں میں تبدیل کر لیتا ہے تو اس کی وقعت بڑھ جاتی ہے، سونا یوں کسی کام کی چیز نہیں لیکن چونکہ ذہن انسانی نے اس کو ایک معیاری قدر و قیمت کی چیز سمجھ لیا ہے اس لئے وہ گراں ہے، الغرض مادہ بذات خود کوئی چیز نہیں اور اگر انسان کی ذہانت خواہ وہ خالص علمی پہلو رکھتی ہو یا جذباتی، اس سے متعلق نہ ہو تو وہ بالکل بے کار شے ہے۔

اب اس نظریہ کو سامنے رکھ کر ایک ”بت“ کی حقیقت پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہے؟ ”بت“ فی الاصل ایک پتھر کا ٹکڑا تھا، جب تک اس کو انسانی ذہانت نے ایک مخصوص شکل میں تبدیل نہ کیا تھا وہ ایک حقیر پارہ سنگ تھا جس وقت تک انسان نے اپنے جذبات کو اس میں مشکل نہ کیا تھا، لیکن ایک ”بت تراش“ کی چھینی اور ایک ”برہمن“ کے جذبہ عقیدت سے مس ہوتے ہی وہ اس قدر مقدس ہو گیا کہ پیشانیاں اس کے سامنے جھکنے لگیں۔ اس لئے اگر ”بت شکنی“ کا بدھ صرف ”وہ پیکر چلکین“ قرار پائے جو مندروں میں رکھا ہوا نظر آتا ہے تو اس سے زیادہ کوتاہ نظری اور کوئی نہیں ہو سکتی، کیونکہ پتھر کو بت بنادینے والی حقیر و ذلیل پارہ سنگ کو ”معبود“ کی حیثیت دینے والی ذہنیت اس سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہزار بت شکنیوں کے بعد بھی بدستور قائم رہ سکتی ہے، اگر کسی مخصوص و متعین ”بت“ کو توڑنے کے بعد کوئی دوسرا بت اس کی جگہ نہ لے سکے تو بیشک ”بت شکنی“ مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ بت پرستی کا تعلق صرف انسان کی ذہنیت سے ہے اس لئے جب تک اس بتکدہ کو نہ توڑا جائے جو انسان کے قلب و دماغ میں چھپا ہوا ہے، یہ مادی بربادیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیا کا تنہا وہ مذہب ہے جس نے بت شکنی میں خاص شہرت حاصل کی، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقصود ”لات و عجل“ کی صرف مورتیوں کو مسمار کر کے خاموش ہو جانا نہیں تھا بلکہ اس ذہنیت کو منہدم کرنا تھا جو انسان کے اندر غلامانہ تزیل پیدا کرتی ہے اور اسی لئے جب کسی بت کو توڑا تو اس کا فلسفہ بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا کہ پرستش کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ اس مادی عالم سے جدا ایک چیز ہے جو خود انسان کے اندر ہی موجود ہے اور جس کا اصطلاحی نام ”خدا“ ہے انسان جسم ظاہری کے لحاظ سے یقیناً فانی ہے، لیکن اپنی معنویت کے لحاظ سے وہ قطعاً غیر فانی ہے، انفرادی حیثیت سے وہ چاہے کتنا ہی بے بود ہو لیکن کلی و اجتماعی حیثیت سے وہ لازوال مقصود آفرینش ہے اور یہی وہ حقیقت تھی جو بعض زبانوں سے ”انا الحق“ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

بہر حال ”بت پرستی“ اگر انسان سے اس جذبہ بلند کو محو کر دینے والی ہے تو یقیناً نہایت مضرت رساں چیز ہے اور اس کو یقیناً مٹ جانا چاہئے، لیکن سوال یہی ہے کہ کیا اس وقت بھی نزع کفر و دین کو جاری رہنا چاہئے اور ایک کے جذبہ بت شکنی کو دوسرے کے جذبہ بت پرستی سے متصادم ہونا چاہئے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ زمانہ وہ ہے جب تمام دنیا سے مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے اور عام طور پر محسوس کیا جا رہا ہے کہ وہ عقول انسانی کا ساتھ دینے کے لئے طیار نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہی وہ زمانہ ہے جب مذہب کا وہ ارتقائی مفہوم ہمارے سامنے آیا ہے جس پر تمام نوع انسانی متفق ہو سکتی ہے اور یہی وہ دور عقل و فراست ہے جس نے حقیقی مذہب کے چہرہ کو بے نقاب کر کے اس کے دلکش خط و حال نمایاں کر دئے ہیں۔

مذہب ضرورت انسانی کی پیداوار تھی اور ہماری ضرورتوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کو بھی چلنا چاہئے اول جب انسان کی ”اجتماعی حیثیت“ محدود طبقوں اور مخصوص قوموں کے لحاظ سے بہت تنگ تھی تو مذہب کا نقطہ نظر بھی تنگ تھا اور ہونا چاہئے تھا، لیکن اب کہ نظام تمدن نے وسیع ہو کر شرق و غرب کے امتیاز کو مٹا دیا ہے اور انسان صحیح معنی میں ”خلیفۃ اللہ فی الارض“ بن کر سارے کرۂ ارض پر چھا گیا ہے، مذہب کو بھی وسیع ہونا چاہئے اس کے مقصود کو بھی بدلتا چاہئے اور اس کے اصول میں بھی وسعت پیدا ہونا چاہئے تاکہ امتیاز نسل و رنگ اور اختلاف مسجد و کلیسہ سے بلند ہو کر تمام

نوع انسانی کو ایک ہی مرکز پر لایا جاسکے۔

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ مذہب کو صرف مابعد الطبیعیات تک محدود رکھا جائے، جزا و سزا کا معیار، بہشت و دوزخ یا نور و قصور کی سطح سے بہت بلند ہو گیا ہے اور اب خدا نام کسی ایسی قہار و جبار مہستی کا نہیں رہا جو کسی خود مختار فرمانروا کی طرح دنیا میں صرف غلامی کو رواج دینا چاہتا ہے۔ مذہب کا دور استبداد (AUTOCRACY) ختم ہو گیا اور اگر وہ اپنے آپ کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو اس کو بھی زمانہ کا ساتھ دینا پڑے گا جو اس وقت صرف عالمگیر سکون و آزادی چاہتا ہے۔ وہ دور جب انسان نے خدا کے ٹکڑے ٹکڑے کر رکھے تھے گزر گیا ہے۔ آج جو خدا عیسائیوں کا ہے وہی ہندوؤں کا ہے، جو ہندوؤں کا ہے وہی مسلمانوں کا ہے جس طرح وہ مسجد کی اذانوں میں چھپا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ ناقوس میں پوشیدہ ہے۔ اس کا سورج سب پر یکساں چمکتا ہے اس کے الطاف سب کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ اس کی محبت ہر ہر فرد کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، اس کے حسن نے کائنات کی ہر ہر چیز کو مسحور کر رکھا ہے اس کے نعموں نے ہر ہر شے کو بہت کر رکھا ہے، وہ ذرہ ذرہ کے اندر سمایا ہوا ہے، وہ کائنات کی نبض میں گرم خون کی طرح دوڑ رہا ہے عالم کھن کے سینہ میں قلب بنا ہوا دھڑک رہا ہے۔ وہ گویا ایک ”مرکز المراكز“ ہے جہاں پہنچ کر ماضی حال و مستقبل سب کی تکمیل ہوتی ہے۔

آج کسی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کا مفہوم کوئی علیحدہ قرار دے اس کا کوئی جدا گانہ تصور پیدا کر کے اپنے لئے مخصوص کر لے۔ مذہب قدسیہ نے عرصہ تک خدا کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن اب وہ اس شکنجے سے آزاد ہو گیا ہے اور اپنا معبود اس نے عقل انسانی کی اس غیر محدود فضا میں تعمیر کیا ہے جہاں وحش و طیور، انس و جن، سیاہ و سفید، جاہل و عالم شاہ و گدا سب ایک سطح پر نظر آتے ہیں اور نوع انسانی اپنی تفریق کو محو کر چکی ہے۔

آج کوئی قوم ایسی نہیں جو برگزیدگی کو صرف اپنے لئے مخصوص کر سکے، کوئی جماعت اس کی مستحق نہیں کہ وہ سوا اپنے باقی سب کو گمراہ قرار دے۔ اگر انسان کی قسمت میں نجات لکھی ہے تو وہ اسی دنیا میں حاصل ہوگی اور نوع انسانی کا ہر فرد اس میں برابر کا شریک ہوگا۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک انعام خداوندی کا مستحق قرار دیا جائے اور دوسرا آلام و مصائب کا شکار بنا رہے اگر معصیت کی بناء پر انسان کو دوزخ میں جانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں جاؤں اور آپ بچ جائیں۔ اچھے یہاں دوزخ ہی رہے گی یا فردوس۔ اور بلا تفریق سب کو اسی ایک سے واسطہ پڑتا ہے۔

یہ دور ہے اشتراکیت کا، اجتماعت کا جب ہر چیز ایک کلی و عمومی حیثیت اختیار کرنا چاہتی ہے اور خدا کی (UNIVERSALITY) حیات انسانی کے ہر پہلو کو ”کائناتی“ بنا دینا چاہتی ہے۔ ہمارا خدا ہمارا معبود، ہمارا مذہب ہماری عبادت، ہماری روحانیت سب کو ”کائناتی“ رنگ اختیار کرنا ہے اور یہی وہ حقیقی مقصود آفرینش تھا جسکی تکمیل کا زمانہ اب آیا ہے۔

خدا اب مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے اندر مقید نہیں رہنا چاہتا، اس کا مطالبہ اب یہ ہے کہ فطرت کی وسعت میں اسے تلاش کیا جائے اور دل کے اندر اس کا استھان بنایا جائے، وہ اب انسان کے بنائے ہوئے معبودوں میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ اس معبود میں جو خود اسی کا بنایا ہوا ہے جہاں بلا تفریق و امتیاز سب کے سر جھک جاتے ہیں اور وہ ”عبد“ انسان کا قلب و دماغ ہے۔

مسجد و کلیسا کی تفریق کا وقت گزر گیا۔ زنا و تبیخ کے امتیاز کا زمانہ ختم ہو گیا جن کو ہم بت سمجھ کر پوجتے تھے وہ از خود سرگود ہوتے جا رہے ہیں، جس کی پرورش ہم خدا سمجھ کر کرتے تھے وہ خود ہم سے ہمراز ہے اس لئے ہم کو بت پرستوں کی جستجو اچھوٹا اور کاشی سے باہر کسی اور جگہ کرنا چاہئے اور پرستار ان خدا کی تلاش حظیم کعبہ سے باہر کہیں اور۔

دنیا میں بُت پرستی اب بھی قائم ہے لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں، بُت شکنی اب بھی ضروری ہے لیکن تیشہ آہنی ہے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بُت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں یہ بُت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔

یہ بُت تم کو خانقاہوں میں زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے، تعلیمی اداروں میں قرآن و حدیث کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے، سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

ان کی صورتیں نورانی ہوں گی، لیکن دل سیاہ، ان کی زبانوں پر خدا رسول کا نام ہوگا لیکن صوفیہ نمود و نمائش لے لے، ان کی تقریروں سے ملک و قوم کی محبت ٹپکتی ہوگی لیکن ان کا مقصود صرف اپنی ذات ہوگی۔ ان کی پیشانیوں پر سجدہ کا نشان، ان کی دامن دار طویل قبائیں، ان کی عریض و طویل داڑھیاں، ان کی ہر وقت گردش کرنے والی فاک شفا کی سمفونیاں۔ ان کی وہ خصوصیات ہیں جن سے تم ان بتوں کو ہمیشہ آسانی سے پہچان سکتے ہو یہ خود کبھی سلام میں تقدیم نہیں کریں گے، کوئی دوسرا سلام کرے گا تو جواب میں کبھی سر نہ جھکائیں گے، جب یہ کسی طرف سے گزریں گے تو ان کی ذریات ایک ہجوم ان کے ساتھ ہوگا اور جب خانقاہوں کے اندر شہ نشینوں پر ان کو بیٹھا دیکھو گے تو یہ معلوم ہوگا کہ خداوند تعالیٰ نے بندوں کو دیدار سے مشرف کر رہا ہے۔

جس وقت یہ قرآن کا درس دے رہے ہوں گے تو سوائے نخوی و صرفی نکات کے کوئی اور موضوع ان کے سامنے ہوگا، جب حدیث پڑھا رہے ہوں گے تو اسماء و جمال کی تحقیق ان کا انتہائی کارنامہ ہوگا، جب یہ منبر پر وعظ فرما رہے ہوں گے تو سوا خدا کے قہر و غضب اور جہنم کے ہولناک مناظر کے وہ کچھ نہ بیان کریں گے، سیرۃ اکابر پر اظہار خیال فرمائیں گے سوا ان باتوں کے جو حماقتوں سے پُر ہیں کوئی لفظ ان کے منہ سے نہ نکلے گا۔ فرشتوں کی باتیں، جنات کے افسانے، معجزہ کرامات کے واقعات اور اسی طرح کے دیگر مزخرفات ان کے مواعظ کی جان ہیں، اخلاق کا درس بھولے سے اگر کبھی دینگے بھی تو وہ بہشت کی طمع، جہنم کے خون سے غالی نہ ہوگا اور ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئے گی کہ نیکی کرنا ہر انسان کا فطری فرض ہے اور اسے خیال مزد و تعزیر سے بہت بلند ہونا چاہئے۔

یہ اگر رواداری و ہمدردی کا درس دے رہے ہوں گے تو یقین رکھو کہ ضرور کسی نہ کسی کا حق غصب کر کے آئے ہیں یہ اگر اہل و عیال کے ساتھ محبت و رافت کا وعظ فرما رہے ہوں گے تو باور کرو کہ ابھی ابھی اپنی بیوی کو ٹھوکر دے مار کر باہر نکلے ہیں، لوگوں کو سچ بولنے کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ جھوٹ بولنے کا حق ان کے سوا کسی اور کو حاصل نہ ہو، عجز و انکسار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ آکر ان کے قدموں کو بوسہ دیں۔

الغرض یہ ہیں وہ بُت جن کو اس وقت توڑنے کی ضرورت ہے اور یہ ہیں آج کل کے وہ "لات و مہل" جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔

تنقیدی اشائے

پروفیسر آل احمد سرور ریڈر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے انیس تنقیدی مقالات کا مجموعہ جو ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ پروفیسر سرور اس عہد کے نہایت مشہور نقادوں میں سے ہیں اور ان کے تنقیدی مقالات سنہ ۱۹۳۲ء صفحات ۲۸۰ - قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

آوارہ گرد اشعار

(۵)

(۱) ترجمی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو کیسے تیرا ناز ہو سیدھا تو کرو تیر کو محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں یہ شعر ناسخ کی نالاک خیالی کے ثبوت میں پیش کیا ہے مگر یہی شعر بجنہ ان کے شاگرد رشید وزیر کے دیوان دفتر فصاحت کے صفحہ ۱۵۵ پر مندرج ہے۔ ناسخ کے دیوان میں یہ شعر نہیں ملتا۔ اگر آزاد کی روایت صحیح ہے جس کا شائبہ نہیں تو یہ شعر استاد کا عطیہ سمجھا جائے گا۔

(۲) ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے آبِ حیات میں صفحہ ۳۶۴ پر یہ بتایا گیا ہے کہ پہلا مصرع ناسخ نے ایک سوداگر بچہ کو جو دولت حسن کا بھی سراپہ دار تھا کچھ جاگتے کچھ سوتے دیکھ کر فرمایا۔ دوسرا مصرع دل خواہ نہیں ہو رہا تھا سو بچے میں تھے کہ خواجہ وزیر آگئے دریافت حال کے بعد ان کے ذہن رسا نے دوسرا مصرع تخلیق کیا۔ چونکہ اس شعر میں وزیر لفظ کے شریک تھے استاد کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا ہوگا کہ یہ شعر اپنے دیوان میں داخل کرتے۔ وزیر ہی کو عنایت کر دیا ہوگا مگر وزیر کے دیوان صفحہ ۲۰۹ پر یہ شعر اس طرح ہے:-

(۳) آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خوابِ ناز ہے فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے سیہ چوری بدستِ آن نگار نازیں دیدم بہ شلغِ صندلیں پیچیدہ مارِ عنبریں دیدم نگار مٹی ۳۳۳ کے ایک مضمون کے حوالے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ شعر نور العین واقعہ بٹالوی شاگرد آرزو نے حزیں کو سنایا تو انھوں نے کہا کہ ”خوب گفتی مگر طول گفتی“ اور دونوں مصرعوں کے آخری ٹکڑوں نازیں دیدم اور عنبریں دیدم کو حذف کر دیا۔ ناصر اپنے تذکرہ ”خوش معرکہ زیبا“ میں رقمطراز ہیں کہ قایم سے نقل ہے کہ ”سودا، حزیں کی ملاقات کو گئے میں بھی ساتھ تھا بہ مجرد خبر ہونے کے فوراً بلایا کچھ پڑھنے کو کہا سودا نے یہ شعر پڑھا:-

سیہ چوری حزیں نے آخری جزد کو محذوف کر دیا۔ تعجب ہے کہ قایم کے تذکرہ میں یہ واقعہ مندرج نہیں لکھا جائے ناصر کا ذریعہ معلومات کیا ہے؟

(۴) مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی غالبؔ پاسِ بختا نہ ہے بی کر کے ابھی آتے ہیں باقر علی باقر پیر بگسوی (گیا) شاگرد غالب کے سامنے کسی نے یہ شعر پڑھا انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ شعر اور غالب کا ہو اسی دن ایک خط غالب کو لکھ کر دریافت حال کیا۔ غالب کا جواب بالفاظ شاہ ظہیر الحق یہ تھا کہ ”اگر یہ شعر میرا ہو تو مجھ پر ایک ہزار لعنت، ورنہ جس نے میری جانب غلط منسوب کیا ہے اس پر دس ہزار لعنت“ مجھ پر کیا شامت آئی تھی

پاس ہی میخانہ ہوتے ہوئے مجلس وعظ میں جا کر بیٹھتا۔ یہ شعر دراصل یوں مشہور ہے :-

مجلس وعظ تو تا دیر رہے گی تاہم ، یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

بعض لوگ اس کو قائم کا شعر سمجھتے ہیں مگر یہ قول قاضی عبدالودود صاحب لفظ "قائم" لازماً بہ طور تخلص نہیں آیا اور نہ یہ شعر دیوان قائم نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے۔ میں نے آوارہ گرد اشعار کے قسط اول میں ظاہر کیا تھا کہ بعض اس شعر کو میر سے بھی منسوب کر دیتے ہیں۔ میر اپنا ذاتی خیال ہے اور اپنی رائے میں اب تک قائم ہوں اور یہ شعر قائم ہی کا ہے جب تک اس کا کوئی دوسرا دعویدار پیدا نہ ہو۔

(۵) میخانہ میں کیا پھرے ہے مشکلی مشکلی ، زاہد عابد سے دور بھٹکی بھٹکی

قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے کانفر ، یہ دختر رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

دختر رز ہی کی طرح یہ رباعی بھی بڑی آوارہ گرد ہے۔ معین الدین دردائی نے بہ حوالہ گلزار ابراہیم اس کو ہیبت قلی خاں حسرت (جن کو وہ خدا جانے کیوں بیعت قلی خاں حسرت کہنے پر مصر ہیں) کے امام منسوب کیا ہے رسالہ معیار پٹنہ صفحہ ۳۴۷ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مجموعہ نغز جلد ۱ صفحہ ۹ خفیف اختلاف کے ساتھ منسوب بہ انشا ہے۔ دیوان تآباں مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں یہ رباعی تآباں کے کلام کے ساتھ مندرج ہے۔

(۶) سرخ جوڑے بہ ترے ہیکل کناری کی جھلک ، برق ساں ابر کے ہوتی ہے نثار دامن

یہ شعر بھی دیوان تآباں میں ہے مگر بہ حوالہ رسالہ معیار صفحہ ۳۴۷ پر شعر انتخاب دیوان بیدار مرتبہ حسرت موہانی میں موجود ہے۔ مجموعہ نغز میں حاشیہ پر یہ عبارت درج ہے کہ "اس شعر در دیوان شاد محمدی بیدار دیدہ شد و ذباں زد عالم است کہ از عبداللہی تآباں است۔ واللہ اعلم بہ حقیقت الحال"

(۷) کیوں ہر کسی کے ساتھ دل اپنا لگا ہے ، ہرے ونا سے کاہیکو عاشق کہا ہے

ہم مان مان آئے ہیں پیراں کی منیتیں ، ساجن گر آئے تو نیازاں چڑھائے

یہ اشعار دیوان تآباں میں نہیں مگر شفیق نے صابر لاہوری سے منسوب کئے ہیں اور وضاحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ ان اشعار کو جو لوگ تآباں سے منسوب کرتے ہیں وہ بیجا ہے۔ کیونکہ میں نے میر صابر کے اعزہ سے سنا ہے کہ یہ اشعار صابر کے نہیں۔

(۸) بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ الخ

یہ مخمس خمائے جاوید میں سودا سے منسوب ہے۔ دیوان تآباں مطبوعہ انجمن میں تآباں کے نام ہے آخری بند میں شعر پایا جاتا ہے :-

کبھو ہوتا ہے میرے ساتھ سودا مجمع طفلان تجلی اس طرح سے دیکھ کر اب غوار و سرگرداں

کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ

خمائے جاوید کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ غزل تجلی کی تھی اس پر سودا نے تضمین کی ہے دیوان تآباں میں سودا کی جگہ تآباں اور تجلی کے بدلے "میرے تئیں" ہے۔ میر نے خیال میں تجلی کا تخلص اس مصرع میں غیر مناسب طور پر آیا ہے۔ اس لئے تجلی کی غزل نہیں ہو سکتی۔ قاضی عبدالودود صاحب بھی لکھتے ہیں کہ تجلی کے دیوان میں یہ غزل نظر نہیں آئی اور وہ اس کو تآباں کا مخمس سمجھتے ہیں۔ لالہ سریرام کے قول کے مطابق چونکہ ان کے کتب خانہ میں متعدد نسخے سودا کے موجود ہیں قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے کسی معتبر نسخے سے اخذ کیا ہو گا۔ میرے پاس جو سودا کا مطبوعہ نسخہ ہے

اس میں صرف ایک بند اس محسوس کا ہے جو دیوان تابان میں نہیں، مگر خمخانہ جاوید والے محسوس میں شامل ہے، چونکہ سودا کا کلیات بہت مستتب ہے اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ محسوس کس کا ہے۔ سودا کا یا تابان کا۔ اگر کسی ایسے نسخے کا پتہ چل جائے جو سودا کی زندگی میں مرتب ہو چکا تھا اور ایسے نسخے لالہ سری رام کے کتب خانہ میں موجود تھے تو فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس محسوس کا حقیقی مصنف کون ہے۔

(۹) دعویٰ کیا تھا گل نے اس رخ سے رنگت ہو کا ماری صبا نے دھولیں شبنم نے منہ پہ تنو کا
یہ شعر میر سوز کا ہے مگر جاں نثار حسین اختر علیگ ابن مضطر نے سالنامہ جمیل ۱۹۳۶ء کے ایک مضمون پر جنوال
”مضطر خیر آبادی“ میں نمٹا اس شعر کو مصحفی سے منسوب کر دیا ہے۔ (۲۲۸) (حوالہ معیار صفحہ ۲۲۸)

(۱۰) آکر ہماری لاشیں پہ کیا یار کر چلے خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے
مغل اور اردو میں نواب نصیر حسین خاں خیال نے خیال کی طلسم بندی کی بنا پر بہت سے اردو کے اشعار اکبر
نور جہاں اور زیب النساء کے نام منسوب کر دیے ہیں، انھیں اشعار میں سے مندرجہ بالا شعر بھی ہے جس کو انھوں نے
زیب النساء کی طرف منسوب کیا ہے۔ ابواللث صاحب صدیقی اپنے ایک مضمون اردو اور اس کے تاریخی مآخذ پر روشنی
ڈالتے ہوئے اس شعر کو مشکوک بتایا ہے مگر یہ نہ بتا سکے کہ شعر ہے کس کا۔ اس مشکل کو قاضی عبدالودود صاحب نے
حل کیا اور یہ بتایا کہ یہ شعر درحقیقت عظیم دہلوی کا ہے۔

(۱۱) یا تنگ ذکر تاصح ناداں مجھے اتنا یا چل کے دکھا دے دہن ایسا کر ایسی
یہ شعر آرزوہ کا مشہور ہے۔ بعض تذکروں میں میری نظر سے گزرا ہے۔ عرش مسانی نے بھی ایک ریڈیائی فیئر میں
مغنیہ کی زبان سے ”شعر آرزوہ ہی کے نام سے گویا ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ کریم الدین صاحب تذکرہ طبقات
نے اس شعر کو ہتھاپ رائے تاپ کشمیری کے نام منسوب کیا ہے۔ جو کریم الدین آرزوہ کے ہم عصر تھے۔
(۱۲) ہم نے ان کے سامنے اول تو خیر رکھ دیا پھر کلیجہ رکھ دیا، دل رکھ دیا سر رکھ دیا
جعفر علی خاں اثر لکھنوی، اصغر کے مندرجہ ذیل شعر ہے

ترے جلوؤں کے آگے ہمت شرح دیں رکھ دی زبان بے نگہ رکھ دی، نگاہ بے زبان رکھ دی
پر اعتراض وارد کرتے ہوئے کہ دونوں قافے غلط ہیں، نہ ہمت رکھنی جاتی ہے نہ نگاہ رکھنی جاتی ہے، یوں رقمطراز
ہیں کہ اس پر وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو تبصرہ میں امیر مینائی کے اس مطلع پر کیا گیا ہے۔
ہم نے ان کے سامنے

جیبہ (یعنی زبان) کی کمی تھی وہ پوری ہو گئی۔ اس شعر کی معنویت سے قطع نظر اثر صاحب نے جو اس شعر کو
امیر مینائی سے منسوب کر دیا ہے وہ صحیح نہیں۔ حقیقت میں یہ شعر داغ کا ہے۔

(پروفیسر) عطاء الرحمن کا کوئی

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل، اسکی نزاکت
بیان، اسکی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول۔ مینجر نگار

تاریخی اور ادبی لطیفے

۱۔ دلی اور لکھنؤ کے اُجڑنے کے بعد رامپور ہی مجمع اہل کمال تھا اور اس کی شہرت نے دوسرے مقامات کے فضلاء میں رقابت سی پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ ریاست ٹونک اور رامپور کے فضلاء میں کسی موضوع پر اختلاف ہوا اور اختلاف نے اتنی شدت اختیار کی کہ ٹونک سے جو آخری مراسلہ آیا اس کے خاتمے پر یہ جملہ بھی تحریر تھا۔ ”ساکنانِ رامپور خراؤند“ اس خط کے جواب کے لئے مولانا شاہ سید رفیع الدرجات صاحب رامپوری نزہت تخلص (متوفی ۱۲۶۵ھ) کو منتخب کیا گیا۔ مولانا نے خط کے مضمون کا جواب لکھنے کے بعد آخری جملے کو صرف نقطوں کے تغیر کے بعد واپس کر دیا۔ یعنی ’س‘ کے اوپر تین نقطے لگائے۔ ’ن‘ کا نقطہ کاٹ کر اس کے نیچے دو نقطے دیدئے۔ باقی جملہ بدستور رہا۔ اس تغیر کے بعد اب جملہ یہ ہو گیا: ”شاکیانِ رامپور خراؤند“

۲۔ دسمبر ۱۸۶۵ء میں نواب خلد آشاں لفٹنٹ گورنر سے ملنے بریلی جا رہے تھے۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا غالب بھی موجود تھے چلتے وقت نواب صاحب نے مسسری طور پر مرزا صاحب سے کہا ”خدا کے سپرد“ مرزا صاحب نے جواب دیا:۔ ”حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے، آپ پھر اٹھا خدا کے سپرد کرتے ہیں“

۳۔ ۱۸۶۲ء میں جب نواب خلد آشاں حج کو جانے لگے تو اعیانِ دولت سے مشورہ کیا کہ ہم غیر ملک کو جا رہے ہیں یہاں سے کون سی چیز ایسی لے جائیں جو نادر ترین ہو اور اہل عرب کے لئے استعجاب کا باعث بھی ہو۔ حاضرین نے مختلف چیزوں کا نام لیا لیکن کوئی چیز اس معیار پر صحیح نہ اُتری۔ ایک صاحب نے کافی غور و غوض کے بعد عرض کیا کہ یہ وصف صرف ”ہاتھی“ میں پایا جاتا ہے۔ اہل عرب بھی اس کو حیرت اور شوق سے دیکھیں گے۔ اور ہندوستان کی ہے بھی نادر اور مخصوص چیز، چنانچہ اس تجویز سے بھرے مجمع نے اتفاق کر لیا۔ لیکن علامہ عبدالحق خیرآبادی اس وقت تک خاموش ہی بیٹھے رہے۔ جب نواب صاحب نے مولانا سے دریافت کیا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا:۔ ”یہ دوسرا ہاتھی ہوگا جو ابرہہ کے بعد مکہ معظمہ بھیجا جائے گا۔“ اس جواب سے مجلس میں سناٹا سا ہو گیا اور اس تجویز پر پانی پھر گیا۔

۴۔ اسی زمانہ میں نواب صاحب کو بغرض روانگی حج، داروغہ محبوب جان (طوائف) نے درخواست پیش کی۔ نواب صاحب نے درخواست پڑھ کر اس پر ’۹‘ کا ہندسہ لکھ دیا۔ محبوب جان وہ درخواست سیدھی مولوی محمد عثمان خاں وزیرِ عظم کے پاس لے گئی اور ’۹‘ کے ہندسہ کا مطلب پوچھا۔ جواب ملا کہ ۹ کے ہندسے سے اس کہادت کی طرف اشارہ ہے:۔ ”نوسو چوہے کھا کے بٹی حج کو چلی“

۵۔ رامپور کے قلعہ میں ایک عمارت ”مصاحب منزل“ کے نام سے مشہور تھی۔ جس میں مصاحبین، شعراء و علماء وغیرہ آکر بیٹھتے تھے۔ نواب خلد آشاں جس کو طلب کرتے وہ اندر جاتا باقی حضرات بیٹھے بیٹھے کسی کسی طرح دل بہلاتے۔ اتفاق سے ایک دن علامہ عبدالحق خیرآبادی آئے تو صاحبِ عالم مرزا رحیم الدین حیا دہلوی کو کسی شخص کے ساتھ شطرنج کھیلتے پایا۔ خود بھی دل بہلانے کی غرض سے شطرنج کی چالیں دیکھنے لگے۔ غصہ یہ ہوا کہ مرزا حیا کے مقابل کو مولانا نے ایک چال بھی بتادی۔ مرزا حیا

بگڑ کر بولے مولانا! یہ منطق و فلسفہ نہیں ہے۔ یہ شطرنج ہے۔ آپ کو اس سے کیا واسطہ۔

یہ سن کر مولانا نے بساط اٹھ دی۔ اور مرزا حیا سے کہا کہ آپ کا کمال اسی میں ہے کہ قہروں کو اسی ترتیب سے چن دو جیسے کہ پہلے تھے۔ چونکہ مرزا حیا کو بساط اٹھنے کا خیال نہ تھا اس لئے ان کے حافظے میں سابقہ ترتیب نہ رہ سکی اور وہ کامیاب نہ ہو سکے تو مولانا نے بساط پر قہرے اسی ترتیب سے چن دئے جیسے کہ پہلے تھے اور کہا:-
”صاحبِ عالم! ہم شطرنج بھی کھیلتے ہیں تو وہ منطق و فلسفہ ہو جاتا ہے۔“

۶۔ اسی مصاحب منزل میں ایک دن علماء کا مجمع تھا۔ مولوی ارشاد حسین صاحب مجددی (استاد نواب خلد آشتیاں) جو فقہ میں کمال رکھتے تھے، کسی عالم سے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ اس عالم نے علامہ عبدالحق سے بھی کچھ پوچھا تو ارشاد حسین صاحب نے کہا کہ عبدالحق صاحب تو خود کہتے ہیں کہ میں فقہ نہیں جانتا۔ پھر ان سے کیا پوچھتے ہو۔ اس پر علامہ عبدالحق نے کہا:-

”میرا مطلب تو یہ تھا کہ میں امام ابوحنیفہ کی برابر نہیں جانتا یہ مطلب تو نہ تھا کہ آپ کی برابر بھی نہیں جانتا۔“

۷۔ ایک مرتبہ نواب خلد آشتیاں نے درباری طوائف ”امانی جان“ سے جس کا رنگ بے حد سیاہ تھا، پوچھا کہ جب روزِ انزل مخلوق کو حُسن تقسیم کیا جا رہا تھا تو اس وقت کہاں تھی؟ جواب دیا ”قسمت کے بازار میں“
وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ میری قسمت میں نہ تھا لیکن بازار کے لفظ نے جس کا خاص تعلق طوائف سے ہے، جملے میں بلاغت پیدا کر دی۔ جس کی وجہ سے یہ جواب نواب صاحب کو بہت پسند ہوا۔ اسی امانی جان کا ذکر منیر شکوہ آبادی نے اس طرح کیا ہے:
جنت، چالاک، شوخ امانی جان،
گفتگو میں بلا کی طراری

۸۔ نواب خلد آشتیاں کے پوتے نواب سید حامد علی خاں الملقب بہ جنت مکاں کے عہد میں عدالت دیوانی کے حاکم ایک مفتی صاحب تھے۔ جو اوقات دفتر کے سختی سے پابند اور علم فقہ میں دستگاہِ کامل رکھتے تھے۔ لیکن ماتحتوں کے حق میں بہت سخت تھے اور بات بات میں شکایت کی رپورٹیں اجلاسِ بالا میں جس کے حاکم مرزا کاظم حسین بیسٹرتھے بھیجتے رہتے تھے۔ محافظ خانہ دیوانی بھی مفتی صاحب کے ماتحت تھا۔ جس میں ایک دفتری بھی تھا۔ اور مفتی صاحب کی سختی اور اہمدوں کی برسرِ لوکی سے نالاں تھا۔ اتفاق سے رامپور میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس کا قافیہ آئی، جانی تھا اور ردیف ”ہے“ تھی۔ وہ بھی غنزل لکھ کر لے گیا۔ جب اس نے یہ شعر پڑھا:-

خط مفتی کو ہے اور اہمدوں کو ہے جنوں

جس عدالت کا میں نوکر ہوں وہ دیوانی ہے

پھر کیا تھا۔ مکرر مکرر کی آوازوں سے مشاعرہ گونج گیا۔ داد کے نعروں نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ اس شعر کی اطلاع صبح کو مفتی صاحب کو بھی ہوئی اور سخت ناراض ہوئے۔

۹۔ میں ۱۹۱۸ء اور ۱۹۱۹ء میں ریاست خیرپور سندھ میں بورڈنگ ہاؤس کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ کبھی کبھی مسٹر غلام محمد صاحب بی۔ اے نائب وزیر ریاست سے بھی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں مولانا آزاد کے خللِ دماغ کا بھی ذکر آگیا کہنے لگے میں جناب آزاد کا شاگرد ہوں ان کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔

۱۰۔ ایک بار میں مولانا آزاد سے ان کے مکان پر ملنے گیا اور آٹنے کی اطلاع بھی کرا دی۔ ان کا معمول تھا کہ میری اطلاع پا کر فوراً ہی باہر آ جاتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ غیر معمولی تاخیر ہوئی۔ دو بارہ اطلاع پر تشریف تو لے آئے لیکن آتے ہی فرمایا:-

بھائی غلام محمد! معاف کرنا مجھے کچھ آنے میں دیر ہوگئی۔ شاید تم یہ سمجھو کہ میں مغرور ہو گیا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت جبریل آئے ہوئے تھے اور مجھے کچھ لکھا رہے تھے۔ تمہیں یقین نہ ہو تو اس عبارت کو خود پڑھ لو۔ اگر جبریل لکھاتے تو محمد حسین تو محمد حسین۔ محمد حسین کا باپ بھی یہ عبارت نہ لکھوا سکتا تھا، میں نے کہا بجا و درست ہے۔

انشر رامپوری

مولانا محمد علی شوہر

ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم سے کسی دوست نے سوال کیا:-
آپ تین بھائی ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تینوں شاعر ہیں۔ آپ کا تخلص جوہر ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی ذوالفقار علی کا تخلص گوہر ہے لیکن شوکت علی کا کیا تخلص ہے؟
مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا:-
"شوہر"

مولانا محمد علی کا جواب بڑا معنی آفریں تھا۔ کیونکہ مولانا شوکت علی واقعی چار بیویوں کے شوہر تھے۔
ایسی بلندی ایسی پستی
ان دنوں کا ذکر ہے جب مولانا محمد علی اخبار ہمدرد کے نایندے کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک بار وہ دوسرے اخباری نایندوں کے ساتھ اوپریگیڈری میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نیچے سے ان کے ایک گہرے کانگریسی دوست نے کہا:-

"جب یہاں تک آگئے ہو تو دو قدم اور سہی، آؤ ہماری جماعت میں شامل ہو جاؤ تاکہ مل کر کام کریں"
مولانا نے جواب دیا:-

"میں آپ کی جماعت میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں، میں تو اس بلندی سے آپ کی پستی کا منظر دیکھ رہا ہوں"

قومی لباس

مولانا محمد علی ایک بار عربی لباس پہن کر اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے تشریف لے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات پنڈت مدن موہن مالویہ سے ہوئی۔ مالویہ جی نے مولانا کے عربی لباس کو دیکھا اور بڑے طنز و انداز میں فرمایا:-

"او ہو — یہ آپ ہیں، میں سمجھا بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لائیں ہیں"

مولانا محمد علی بھلا کب چوکنے والے تھے، جواب دیا:-

"معاف کیجئے مالویہ جی، بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیردل خاتون اس زمانہ مجلس میں آنا کب پسند کر سکتی ہیں"

مولانا محمد علی ذرا اور آگے بڑھے کہ ان کی ملاقات سردار ولیمہ بھائی پٹیل سے ہوئی۔ سردار پٹیل نے مولانا کا تعارف ایک انگریز سے کرایا۔ انگریز نے مولانا کے عربی لباس کو دیکھ کر کہا:-

"آپ تو اس لباس میں پورے عرب معلوم ہو رہے ہیں"

اس پر مولانا نے کہا:-

"میں چودہ برس تک انگریزی لباس پہنتا رہا۔ لیکن کسی نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ آپ انگریز معلوم ہوتے ہیں"

رسالہ "انسان"

آج میں نے اپنا مذہبی لباس پہنا تو آپ کی رگ تنقید یکایک پھٹک اٹھی۔

باب الاستفسار

کوثر و تسنیم

(جناب فضل اللہ صاحب - گوجرانوالہ)

کلام مجید میں بہشت کی بہت سی نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، انہیں میں سے کوثر و تسنیم بھی ہیں۔ جن کے متعلق تفسیروں میں بعض ایسی باتیں ظاہر کی جاتی ہیں جو سمجھ میں نہیں آتیں۔ اگر تفسیروں کے بتائے ہوئے مفہوم کے علاوہ ان کا کوئی اور مفہوم ہے تو وہ کیا ہے۔

(نگار) قرآن پاک میں کوثر اور تسنیم کے الفاظ صرف ایک جگہ استعمال کئے گئے ہیں۔ کوثر کا لفظ مشہور سورہ الکوثر میں نظر آتا ہے: "انا اعطینک الکوثر" اور تسنیم کا لفظ سورہ "مطففین" میں: "ومزاجہ من تسنیم"۔ ان دو جگہ کے علاوہ ان الفاظ کا استعمال قرآن میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ اب ان کی حقیقت بھی سن لیجئے اور ہمارے مفسرین و واضعین احادیث نے ان پر جو باندھنوں باندھے ہیں وہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ سورہ کوثر بالکل ابتدائی زمانہ اسلام میں نازل ہوئی تھی جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور اسلام کی سخت مخالفت پر آمادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اول اول انسان جب کوئی کام شروع کرتا ہے اور فوائد معاشی آتے ہیں تو اس میں بددلی سی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی کامیابی کی طرف سے مایوس سا ہونے لگتا ہے۔ لیکن اگر ایسے وقت میں کوئی سہارا دینے والا یا ڈھارس بندھانے والا پیدا ہو جاتا ہے تو وہ پھر تازہ جوش سے اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ رسول اللہ اور ان کے چند ساتھی ابتداء اسلام میں اس مایوس کن منزل سے گزر رہے تھے کہ خدا نے سورہ کوثر نازل کر کے ان کی ہمت میں تازگی بخشی اور ان کے ولولہ عمل میں نئی زندگی پیدا کی۔ اس سورہ میں رسول اللہ کو مخاطب کر کے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ "اے رسول تم گھبراتے کیوں ہو، ہم نے تو تمہارے لئے کوثر (خیر کثیر) مقدر کر دیا ہے، اس لئے اٹھو، اور قربانی پر آمادہ ہو جاؤ، تمہارے برا چاہنے والے خود ہی محسوس و ناکام رہیں گے" (ملاحظہ ہو سورہ الکوثر)

لفظ کوثر بروزن "فعل" لفظ کثیر کا مبالغہ ہے، یعنی کثیر کے معنی اگر زیادہ کے ہیں تو کوثر کا مفہوم ہوگا "بہت زیادہ" عربی زبان میں یہ لفظ، عہد جاہلیت کی شاعری میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور "خیر کثیر" ہی کے مفہوم میں۔ علاوہ اسکے ابن ہشام نے بھی یہی مفہوم ظاہر کیا ہے اور بعض مفسرین نے بھی یہی معنی مراد لئے ہیں، لیکن اب نہ ابن ہشام کو کوئی دیکھتا ہے نہ تفسیر متقدمین کو بلکہ صرف ان لغو و زہل روایات کو جو بعد کو رسول اللہ سے منسوب کر دی گئیں اور جن کے

سے اسوقت کی تمام متداول تفسیریں بھری پٹری ہیں۔

اب مختصراً ان واضعین احادیث کی گل افشائیاں بھی ملاحظہ فرالیجئے۔

”رسول اللہ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ کوثر کیا چیز ہے تو آپ نے جواب دیا کہ کوثر بہشت کی ایک نہریا دریا کا نام ہے۔“

رسول اللہ سے کوثر کے بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک عوض ہے جو خصوصیت کے ساتھ انھیں کے

لئے طیار کیا گیا تھا اور آپ نے اسے دیکھا بھی تھا (طبری نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے) معراج کے وقت۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ کوثر کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ کوثر کا پانی شراب ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ نہر کوثر کے ساحل سونے کے ہیں اور اس کی تہ میں موتی اور لعل بکھرے پڑے ہیں۔

یہ ہیں چند منجملہ ان خرافات کے جنہیں واضعین احادیث نے رسول اللہ کی ذات گرامی سے منسوب کیا اور کوثر کے

مع مفہوم ”خیر کثیر“ کو دنیا سے محو کر دیا۔

پھر لطف یہ ہے کہ ان احادیث گھڑنے والوں نے جو کچھ ظاہر کیا ہے وہ خود ان کا پیدا کیا ہوا لٹریچر نہیں ہے کہ

ازکم ان کی ادبی ذہانت و رومان آفرینی ہی کی داد دیجاتی، بلکہ یہ سب کچھ انھوں نے عیسائیوں اور یہودیوں کی ان روایات

لیا ہے جو مابعد الطبیعیاتی عقاید کے سلسلہ میں ان کے یہاں بکثرت نظر آتی ہیں۔

تسنیم کا لفظ کلام مجید میں صرف ایک جگہ سورہ مظفین میں آیا ہے۔ یہ سورت بھی ان ابتدائی صورتوں میں سے

جو مکہ میں نازل ہوئیں اور اس سورت میں بھی سورہ کوثر کی طرح رسول اللہ کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ گھبراؤ نہیں، تمہارا

ن کام ہوں گے اور تم اخیر میں کامیاب ہو گے۔ اس ناکامی و کامیابی کا ذکر اس سورت میں نسبتاً زیادہ تفصیل کے

ساتھ کیا گیا ہے اور جس میں دشمنوں کے لئے سبب اور مسلمانوں کے لئے علیین کا وعدہ کیا گیا ہے (آئندہ ہم سب

علیین کی بابت بھی اپنا خیال ظاہر کریں گے) اسی سورت میں ابرار و مقربین (مبند اخلاق رکھنے والوں) کے

لقن کہا گیا ہے کہ ”یستقون من حیق مخوم“ — مزاج من تسنیم۔

عام طور پر مفسرین کا خیال ہے کہ ”تسنیم“ کسی خاص فرد کی چشمہ کا نام ہے اور وہ حیق (شراب) جو مقربین

پینے کے لئے ملے گی اسی چشمہ کے پانی یا شراب کے امتزاج کا نتیجہ ہوگی (گویا آج کل کی اصطلاح میں یہ کاک ٹیل ٹنم

خیر ہوگی)۔ حالانکہ تسنیم کا مادہ ”س۔ ن۔ م“ ہے جس کے معنی بلند ہونے کے ہیں، اور اسی سے پتہ چلتا ہے

حیق کا لفظ بھی دنیاوی شراب کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا (کیونکہ بلندی سے آنے والی شراب کوئی معنی

ن رکھتی) اور مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ ابرار و مقربین کا مستقبل بہت شاندار ہے اور ان کے لئے بڑی بڑی

نیں مقدر ہو چکی ہیں۔

لفظ تسنیم کے متعلق ہم نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس کی تصدیق الفاظ علیین اور سبجین سے بھی ہوتی ہے جو اسی

رت میں استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) ”ان کتاب الفجار لفی سبجین۔ وما ادراک ما سبجین۔ کتاب مرقوم“

(۲) ”ان کتاب الابرار لفی علیین۔ وما ادراک ما علیون۔ کتاب مرقوم“

یعنی فجار کے مقسوم میں صرف ”سبجین“ (قید خانہ) ہے اور یہ سبجین ان کے اعمال بدی کا دوسرا نام ہے۔

اور ابراہیم کے لئے علیین (بندر مقام) مقرر ہو چکا ہے اور یہ بندر مقام خود ان کے اعمال نیک کے سوا کچھ نہیں۔
مگر ان کے متعلق بھی مفسرین نے بعض بہت عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں مثلاً :-

- ۱- سجین کی ایک وادی کا نام ہے۔
- ۲- سجین زمین کا سب سے آخری (ساتواں) طبقہ ہے جہاں ابلیس مقید ہے۔
- ۳- سجین ایک چٹان ہے زمین کے ساتویں طبقہ سے بھی نیچے۔
- ۴- سجین وہ مقام ہے جہاں گناہگاروں کی روئیں رہتی ہیں۔
- ۵- سجین ایک رجسٹر ہے جس میں گناہگار اس وجہ کی بدکاریوں کا حال درج ہوتا رہتا ہے۔

اسی طرح علیین کی بابت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہے یا یہ کہ وہ بھی ایک رجسٹر ہے جس میں اچے کاموں کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔

الغرض کوثر و نسیم اور سجین و علیین کے متعلق جو عام عقیدہ مسلمانوں میں پایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مفسرین نے ان کی بابت جو عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں، وہ ان روایات سے ماخوذ ہیں جو یہود و نصاریٰ کے لٹریچر و متبع میں مذہب اسلام کا تفوق ثابت کرنے کے لئے گھڑی گئی اور صداقت کا رنگ دینے کے لئے انہیں رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ بہشت و دوزخ کے بیان کے سلسلہ میں خود قرآن مجید میں بھی ایسی آیات پائی جاتی ہیں جن سے ان کا مادی پہلو بھی سامنے آتا ہے، اور انہیں آیتوں نے لوگوں کو زیب و استاں کے لئے بہت سی لغو و موضوع روایات گھڑنے پر آمادہ کیا ہے، لیکن قرآن کا اگر غایر مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ یہ تمام بیانات محض تمثیلی ہیں اور دوزخ و جنت یا عذاب و ثواب نام صرف ان احساسات و نتائج کا ہے جو ایک قوم کے عروج و زوال سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس موضوع پر چونکہ ہم تفصیل کے ساتھ اس سے قبل بار بار اظہار خیال کر چکے ہیں اس لئے ان کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں۔

جھوٹا اشتہار دینا حرام ہے پس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی چھوٹ صداقت نہیں ہے ماننا آپ کا فعل ہے

معجون شہرہا دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہو

کے لئے اکبر صفت ہے۔ ہدایت بڑے سبب کھاتے ہیں اس دوا کے

مضامین میں یکے کو ایک ہی ادویات اور کثرت جات یکا رہیں اس سے بہت کم

پرستی ہے کہ نہ تین سیر و دوا اور پانچ گھنٹہ میں کر سکتے ہیں اس قدر ترقی

دماغ ہے کہ بچپن کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں اسکو مثل آبجیات کے

تصور فرمائیے۔ اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیں ایک شیشی

آٹھ سات سیر وزن آپ کے جسم میں اضافہ کر دے گی۔ ایک استعمال کرنے سے

دماغ کم کرنے سے مطلقاً تھکن نہ ہوگی اور یہ دوا زخا رول کو مٹا

کھانے کے پھول کے شریخ اور مثل کندہ کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا

جی نہیں بلکہ ہزاروں مالوسا اس کے استعمال سے ہمارا بدن خوش

پندہ و سوز سال کے جوان بن گئے ہیں۔ یہ نہایت دیرینہ ترقی دہ ہے کہ

آپ کو یہ قوت نہیں کر سکتے اللہ۔ اس کی صفت تحریر میں نہیں آ سکتی۔

جبریت کر کے دیکھ لیے اس سے ترقی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی ۲۲ خوراک چار روپیہ (لکھنؤ)

نوٹ :- نایدہ نہ ہو تو قیمت دلیں۔ فہرست دوا خانہ صفت ملگائی

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھنا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے

فحائلوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۲۳ سالہ شہرت پر غور فرمائیے۔

پتہ :- حکیم شامست علی شیخ زبان خوش کلام

(عالم شہری مولانا روم صاحب)

محمود مگر سے لکھنؤ۔ یو۔ پی

مئے دوشینہ

(مسعود اختر جمال)

نذر د شکر کا الہام کے نذر کروں
 نہ وہ رندانِ خوش اوقات - نہ وہ بزمِ وفا
 کیا کروں ہائے دمکتی ہوئی صبحوں کا قصوں
 اب کے پیش کروں عشق کے لمحات حسیں
 انقلابات کا آئینہ کے دکھلاؤں
 معبود دل - تری فوخیز تمناؤں کے
 مرے عشرتِ آغاز پر ادبِ وفا
 اٹھ گئے بزم سے رندانِ بلا نوش جمال
 مئے دوشینہ کا یہ جام کے نذر کروں

ظہیر صدیقی :-

یہ جانتا ہوں کہ سرن میرا ہی دل اسیر الم نہیں ہے
 اس آگہی کو مگر کروں کیا، یہ وجہ تسکین غم نہیں ہے
 جو لوگ موت کو ظالم قرار دیتے ہیں
 خدا ملائے انہیں زندگی کے ماروں سے
 حسن تکمیل دیکھئے غم کا
 اپنے آنسو ہیں اپنا دامن ہے
 طنز ہو جو قسمت پر یا حجاب ہو غم کا
 سوختہ نصیبوں کو وہ ہنسی غنیمت ہے
 ہر نفس زندگی کا ماتم ہے
 اور حالِ تباہ کیا کہئے
 یہ شکل مرگ بھی غم سے حجاب ممکن ہے
 نہیں ضرور کہ یارب! مجھے خوشی ہی ملے
 رحم لے دوست کہ ان تیرے تغافل کے سبب
 زندگی تشنہ تکمیل رہی جاتی ہے
 ہم اب غم کے ساتھ تہ اب ہیں خوشی کے ساتھ
 جینے کو جی رہے ہیں مگر بے حسی کے ساتھ

نظر سیہوری :-

دامن کسی کا ہے مرے دستِ سوال میں، اک خواب ہے کہ دیکھ رہا ہوں خیال میں
پھیلی سیاہ خانہ دل میں نہ روشنی کتنے ہی مہر و ماہ بنائے خیال میں
تیری عطا کی خیر ہو، میری طلب ہی کیا اتنی تو وسعتیں بھی نہیں ہیں خیال میں
ہنگامہ ہائے زلیت سے فرصت ملی جہاں چپکے سے آگیا کوئی میرے خیال میں
جاتے ہو مجھ سے دور مگر اتنی دور جاؤ چاہوں بھی میں تو آؤں میرے خیال میں
کیا جانے کتنے حشر ازل میں سمودے اور وہ بھی ایک پیکرِ حسن و جمال میں
آسودگی زلیت کا مفہوم اسے نظر، آسودگی فکر ہے میرے خیال میں

مسعود اختر جمال :-

ہے وقت کی مصلحت کا ماتم - یہ انقلاب جہاں نہیں ہے
ایکھی تو آغازِ داستان ہے - شباب پر داستان نہیں ہے
ابھی یہ تخیلِ راہبانا - حقیقتوں کا نہیں فناء
ابھی یہ احساسِ شاعرانہ - حیات کا راز داں نہیں ہے
یہ جامِ جم کا طلسمِ رنگیں - نقوشِ سیمیں - بساطِ زندگی
یہ تیرہ بختوں کا خوابِ رنگیں - نشاطِ دل کا جہاں نہیں ہے
جہاں پہ خوابِ آفریں جریں ہو - جہاں پہ رنجِ پافِ نفس ہو
جہاں نظرِ دامِ خار و خس ہو - قفس ہے وہ آشیاں نہیں ہے
یہ جلوہ گاہِ طرب ہے کیسی - یہ بزمِ شعر و ادب ہے کیسی
یہاں پہ ہیں نکتہ چیں ہزاروں - مگر کوئی نکتہ داں نہیں ہے
غزل کے شیرایو تمھیں سے خطاب میں آج کر رہا ہوں
اُٹھو کہ یہ رزمگاہِ ہستی فریبِ وہم و گماں نہیں ہے
سمجھ رہے ہو کہ باخبر ہو - مگر نہیں ہے خبر - تم کو
حیات کے ماسوا جہاں میں کوئی بھی شے جاوداں نہیں ہے
میں ظلمتِ شب نہیں سحر ہوں - میں عصرِ نو کا پیام بر ہوں
مری محبت نہیں ہے فانی - مری وفا رائیگاں نہیں ہے
مکاں تو کیا - لامکاں پہ بھی ہے - مرے تصور کی حکمرانی
مرے خیالات کی روانی - بقیدِ عمر رواں نہیں ہے
نہ بزمِ رنداں میں جذبِ مستی - نہ اہلِ عرفاں میں کیفِ ہستی
جمالِ میرے شعورِ غم کا ابھی کوئی راز داں نہیں ہے